ستمبر ۱۹۹۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

امیر تنظیم اسلامی کا ایک فکر انگیز خطاب

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی

رفقاء و احباب نوٹ فرمالیں!

تنظیم اسلامی کا سالانہ اجتماع

ان شاء اللہ العزیز، ۲۹ تا ۳۱/ اکتوبر ۱۹۹۳ء

قرآن آڈیٹوریم، اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

میں منعقد ہو گا

- اجتماع کا آغاز جمعہ، ۲۹ اکتوبر کو امیر تنظیم اسلامی کے خطاب جمعہ سے ہو گا!
- اس ضمن میں رفقاء کے لئے تفصیلی ہدایات آئندہ 'میثاق' میں شائع کی جائیں گی!

☆ ☆ ☆

ماہ ستمبر میں تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام

مبتدی تربیت گاہ

شہر پشاور میں، ۱۷ تا ۲۳ ستمبر منعقد ہو گی۔ انشاء اللہ

بمقام: دفتر تنظیم اسلامی پشاور، ۶۔اے، رحمٰن پلازہ، خیبر بازار

فون: 216346

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۲
شمارہ: ۹
ربیع الاوّل ۱۴۱۴ھ
ستمبر ۱۹۹۳ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت	۳۰ سعودی ریال یا ۸ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک جاپان وغیرہ۔	۱۱ امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۱۴ امریکی ڈالر
ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر	۶ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقامِ اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰۔ فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرض احوال ——— ۳

حافظ عاکف سعید

☆ تذکرہ و تبصرہ ——— ۵

بیسویں صدی عیسوی ـــ سابقہ اور موجودہ مسلمان امتیں

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ نبی اکرمؐ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں ——— ۱۹

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ تنظیم اسلامی کی دعوت ——— ۵۴

نجیب صدیقی

☆ افکار و آراء ——— ۵۸

سود سرمایہ داری کی جان.....

مولانا مقصود احمد

☆ اسلام اور پردہ ——— ۶۱

○ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تحریر سے ایک اقتباس

○ مظہر علی ادیب کا مراسلہ

☆ رفتار کار ——— ۶۵

○ کراچی میں مبتدی تربیت گاہ کا انعقاد

○ دیر میں جلسہ خلافت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض احوال

انتخابات کی تاریخ جوں جوں نزدیک آرہی ہے' اس کے انعقاد کے بارے میں اندیشوں اور وسوسوں میں اسی نسبت سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ملکی اقتصادی ڈھانچے کی اوور ہالنگ کے ضمن میں جس نوعیت کے اقدامات نگران حکومت کر رہی ہے اس سے اس شبہے کو تقویت ملتی ہے کہ الیکشن کرا دینا نگران حکومت کی ترجیحات میں سرفہرست نہیں بلکہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے مطالبوں کو "باحسن وجوہ" پورا کرنا اور امریکی پالیسی کا پورے طور پر نفاذ اسکی ترجیح اول ہے۔ گو ماضی کی ہماری حکومتوں کا ہدف بھی اصلاً امریکہ کی خوشنودی کا حصول رہا ہے لیکن موجودہ نگران حکومت کا معاملہ اس ضمن میں ایک قدم آگے کا ہے کہ وہ ہے ہی امریکہ کی تشکیل کردہ! چنانچہ وہ ہر قسم کی مخالفت اور ملامت سے بے پرواہ ہو کر ہر وہ قدم اٹھا رہی ہے جس کے اٹھانے سے قبل کسی منتخب سیاسی حکومت کو دس بار سوچنا پڑتا اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے سو جتن کرنے پڑتے۔ ہماری حکومت کی ڈور کہاں سے ہلائی جا رہی ہے' یہ معاملہ اب کسی سے مخفی نہیں رہا' ایک عام آدمی بھی اب اس بات کو محسوس کرنے لگا ہے اور اس کے بیان میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا کہ اس سے قبل امریکہ کی حکومت ہم پر بالواسطہ طور پر تھی اور اب وہ بلاواسطہ ہم پر حکمرانی کر رہا ہے۔

۱۲ ربیع الاول کو بوقت فجر لاہور کی ایک مسجد میں ہونے والے اس خونیں سانحے نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا ہے جس میں کسی شقی القلب شخص کی اندھا دھند فائرنگ سے آٹھ نمازی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور متعدد موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اس واقعے کے محرکات ابھی پورے طور پر منظر عام پر نہیں آئے اور ہر جانب سے قیاس آرائیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ واقعہ فرقہ وارانہ منافرت کا شاخسانہ ہے اور بعض اسے تخریب کاری اور دہشت گردی کا مظہر قرار دیتے ہیں کہ اس سے مقصود ملک گیر سطح پر سراسیمگی اور دہشت پھیلا کر ایسے حالات پیدا کرنا ہے کہ انتخابات کا انعقاد غیر یقینی ہو جائے۔ بہرکیف یہ واقعہ ہر اعتبار سے انتہائی قابل مذمت ہے اور اگر موجودہ نگران حکومت اس واقعے کے مجرموں کو بے نقاب کر کے انہیں قرار واقعی سزا دلوا سکے جیسا کہ وہ ٹیکس نادہندگان اور قرضہ ہڑپ کرنے والوں کو بے نقاب کرنے کا فریضہ سرانجام دے رہی ہے جو اپنی جگہ ایک قابل تعریف کام ہے' تو یہ واقعی ایک کار خیر ہو گا اور

ایسا کارنامہ ہوگا جس کے ذکر سے تاحال پاکستان کی تاریخ کے اوراق خالی ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے حالات اتنے دگرگوں کیوں ہیں' اور ان کا ذمہ دار کون ہے؟ ہم اس درجے بے بس اور لاچار کیوں ہو گئے ہیں؟ ایک آزاد ملک کے شہری ہونے کے باوجود امریکہ نے جبراً اپنا "وائسرائے" ہم پر لا بٹھایا ہے اور ہمارا سرِ تسلیم اس کے احکام کے سامنے خم ہے۔ اور آیا اس صورتحال سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے کہ نہیں.؟

اس کا سیدھا جواب تو یہی ہے کہ "اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!"---اس صورتحال کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ یہ ہمارے کرتوتوں کا انجام ہے۔ ہمارا قومی جرم یہ ہے کہ ہم نے اللہ سے پختہ وعدہ کرنے کے باوجود اس ملک میں کہ جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا' اسلام کو بالادست کرنے اور اس کے نظام عدل اجتماعی کو قائم و نافذ کرنے میں تساہل ہی نہیں تغافلِ مجرمانہ سے کام لیا۔ یہ ایک جرم اتنا بڑا تھا کہ اس کی پاداش میں پوری قوم بتدریج نفاقِ عملی میں مبتلا ہو گئی۔ اس لئے کہ اس جرم کا ارتکاب کرتے ہمیں ۴۷ برس بیت گئے ہیں۔۔ "یہ نصف صدی کا قصہ ہے' دو چار برس کی بات نہیں!" چنانچہ ملکی سطح پر اب ہمارا کوئی ایک ادارہ بھی ایسا نہیں ہے کہ جہاں کرپشن' بددیانتی اور بے اصولی نے اپنے جھنڈے نہ گاڑے ہوں! ان حالات میں کوئی جزوی اصلاح ہرگز مفید مطلب نہیں ہو سکتی۔ ہمارے جرم کی تلافی کی واحد صورت یہ ہے اور اسی سے ملک و قوم کی ڈوبتی کشتی کو صحیح معنوں میں سہارا مل سکتا ہے کہ یہاں اسلام کے محض نعرے لگانے کے بجائے اس نظامِ عدل اجتماعی کو پورے طور پر نافذ کریں۔ وہ نظام جہاں حاکمیت صرف اللہ کی ہو' جہاں قرآن و سنت کو غیر مشروط نظام بالادستی حاصل ہو' یعنی عدل و قسط پر مبنی وہ نظام کہ جس کے خدوخال ہمیں خلافت راشدہ کے عہد میں نظر آتے ہیں۔ یہی نظام اس دنیا میں بحیثیت قوم ہماری آخری پناہ گاہ ثابت ہو سکتا ہے ورنہ کون سے دھکے ہیں جو ہم نے نہیں کھائے! اور اگر اس نظام کے قیام کے لئے ہم نے سنجیدہ اور سرتوڑ کوشش نہ کی تو خاکم بدھن' آئندہ بھی دھکے ہی ہمارا مقدر رہوں گے اور یہ دھکے کھاتے نہ معلوم ہم کس ہولناک کھائی میں جا گریں گے!!

یہاں یہ بات ضرور واضح رہنی چاہئے کہ انتخابات کے ذریعے سے یہ منزل ہرگز سر نہیں ہو سکتی۔ جو دینی قوتیں یہ سمجھتی ہیں کہ عوام نے دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کو آزما لیا ہے اور ان سے سخت بددل اور مایوس ہو کر اب وہ "ناچار" ہماری ہی جھولی میں اپنا ووٹ ڈالیں گے' وہ سخت غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ہمارے یہاں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی جڑیں جس درجہ گہری ہیں اس

(باقی صفحہ ۷۲ پر)

تذکرہ وتبصرہ

ڈاکٹر اسرار احمد

بیسویں صدی عیسوی
سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمّتیں

(بشکریہ 'نوائے وقت')

بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بھی تاریخ میں یادگار رہے گی کہ اس کے اوائل میں عظیم سلطنتِ عثمانیہ کے پرزے اڑ گئے اور اواخر میں عظیم سوویٹ یونین کی دھجیاں بکھر گئیں' لیکن ہمارے موضوع کے اعتبار سے اہم تر بات یہ ہے کہ اس کے دوران معزول شدہ اور موجودہ مسلم امتوں یعنی یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کے ضمن میں دو بالکل مخالف اور متضاد کیفیات کا عمل دخل بالکل اسی شان کے ساتھ جاری رہا جو سورۃ الرحمٰن کی آیات ۱۹-۲۰ میں بیان ہوئی ہے یعنی مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ○ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ○ (ترجمہ: "چلائے دو دریا ایک دوسرے سے متصل لیکن ان کے مابین ایک پردہ حائل ہے جس کے باعث وہ ایک دوسرے پر غالب نہیں آسکتے") -- یعنی ایک جانب ان دونوں پر اللہ کے عذاب کا وہ سلسلہ نہ صرف جاری رہا بلکہ بعض اعتبارات سے شدید تر ہوگیا جو یہودیوں کے معاملے میں تو لگ بھگ دو ہزار برس سے جاری تھا اور مسلمانوں کے معاملے میں بھی کئی صدیوں سے چلا آرہا تھا' لیکن دوسری جانب ان دونوں ہی امتوں میں ایک احیائی عمل بھی شروع ہوا اور دونوں ہی بعض اعتبارات سے تیزی کے ساتھ ترقی اور عروج کی جانب بڑھتی نظر آئیں۔

واضح رہے کہ اس سے قبل ان کالموں میں اللہ تعالیٰ کے قانونِ عذاب کی جو تفصیل بیان ہوچکی ہے اس کے مطابق یہودی اب سے لگ بھگ دو ہزار برس قبل عذابِ استیصال کے مستحق ہوچکے تھے' اس لئے کہ حضرت مسیح علیہ السلام ان کی جانب رسول کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تھے' جیسے کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۴۹ اور سورۃ الصّف کی

آیت ۶ میں صراحتاً مذکور ہے، لیکن یہودیوں نے نہ صرف یہ کہ ان کا انکار کیا بلکہ ان کی والدہ محترمہ حضرت مریم صدیقہ سلامٌ علیہا پر بدکاری کا الزام عائد کیا، اور خود آں جنابؑ کو جادوگری اور ارتداد کے الزامات کے تحت واجب القتل قرار دیا اور اپنے بس پڑتے تو انہیں سولی پر چڑھوا کر ہی دم لیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر آپؑ کو زندہ آسمان پر اٹھالیا اور (انجیل برنباس کے مطابق) آپؑ کی صورت میں درحقیقت آپؑ کے اس غدار حواری یہوداہ اسکریوتی کو سولی چڑھوا دیا جس نے سونے کے تیس سکوں کے عوض مخبری کرکے آپؑ کو گرفتار کرایا تھا۔ تاہم ایک خاص حکمت کے تحت (جس کا ذکر بعد میں آئے گا) اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس آخری سزا کی تنفیذ کو مؤخر رکھا۔ سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کی آیت ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے موقع پر اللہ نے آپؐ کی رحمۃٌ لّلعالمینی کے صدقے یہود کو بھی ایک موقع توبہ کا عنایت فرمایا تھا بفحوائے: "عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا" یعنی "تمہارا رب اب بھی تم پر رحم فرمانے کے لئے آمادہ ہے، لیکن اگر تم نے سابقہ روش برقرار رکھی تو ہم بھی وہی کریں گے جو پہلے کرتے رہے ہیں!" یہ گویا جدید عدالتی اصطلاح میں ایک رحم کی اپیل کا آخری موقع تھا جو یہودیوں نے اپنی سرکشی کے باعث گنوادیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آخری فیصلہ صادر فرمادیا:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ

(الاعراف: ۱۶۷)

"جب اعلان کردیا تیرے رب نے کہ وہ قیامت کے دن تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو انہیں بدترین عذاب دیتے رہیں گے!"

اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کا سب سے نمایاں مظہر اس بیسویں صدی کے وسط میں سامنے آیا جب ہٹلر نے نہ صرف جرمنی بلکہ مشرقی یورپ کے تقریباً تمام ممالک کے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو ایسے سپیشل گیس چیمبرز اور ایکسٹر مینیشن پلانٹس کے ذریعے نیست و نابود کیا جن کی نظیر غالباً پوری انسانی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ لیکن دوسری جانب یہ معجزہ بھی اسی بیسویں صدی میں ظاہر ہوا کہ جو ملعون و مغضوب قوم دو ہزار برس سے دربدر بھٹک رہی تھی اور کہیں امان نہیں پارہی تھی اسے دوبارہ اپنے خوابوں کی سرزمین یعنی فلسطین

میں پاؤں جمانے کا موقع ملا۔ چنانچہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران انگریزوں نے عربوں سے جو بغاوت ترکوں کے خلاف کرائی تھی جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ عظیم سلطنتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوا بلکہ مسلمانانِ عالم کی وحدتِ ملی کا نشان یعنی خلافت کا ادارہ بھی ختم ہوگیا' اس کا "انعام" انہیں حکومتِ برطانیہ کی جانب سے ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کے "اعلان بالفور" کی صورت میں ملا' جس کے نتیجے میں پہلے سرزمینِ فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری ہوئی اور بالآخر ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا خنجر ان کے سینے میں پیوست کر دیا گیا۔ گویا کہ یورپی استعمار کی صورت میں موجودہ امتِ مسلمہ پر اللہ کی جو سزا گزشتہ تین صدیوں سے تدریجاً بڑھ رہی تھی اس کے آخری اور شدید ترین دور کا "آغاز" ہوگیا۔ یعنی امتِ مسلمہ کے افضل ترین حصے یعنی عربوں پر اللہ کی ایک مغضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں ذلت آمیز شکستوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جس کی پہلی قسط تو ۱۹۴۸ء ہی میں مل گئی تھی جب انگریزی فوج کے فلسطین سے نکلتے ہی عربوں اور یہودیوں میں جنگ شروع ہوگئی جس کے نتیجے میں بجائے اس کے کہ یہودیوں کو کوئی نقصان پہنچتا وہ اس رقبے سے بھی زیادہ پر قابض ہوگئے جو انہیں تقسیم کے فیصلے کے تحت ملا تھا!

"امیین" پر اللہ کے عذاب کا دوسرا اور شدید تر کوڑا لگ بھگ بیس برس بعد ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ میں نہایت ذلت آمیز ہی نہیں' حد درجہ شرمناک شکست کی صورت میں پڑا' جس کے نتیجے میں ۱۹۴۸ء میں قائم ہونے والے اسرائیل نے "عظیم تر اسرائیل" کی جانب مزید پیش قدمی کرلی اور مصر و شام اور اردن سے اضافی علاقے ہتھیا لئے ـــــ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے مذہبی مرکز یروشلم پر بھی قبضہ حاصل کرلیا۔ "آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!"

قصہ مختصر' بیسویں صدی عیسوی میں ایک جانب سابقہ اور معزول شدہ امتِ مسلمہ یعنی یہودیوں پر اللہ کے آخری عذابِ استیصال کا ریہرسل یا ٹریلر بھی "ہالوکاسٹ" کی صورت میں سامنے آگیا اور دوسری طرف ان کے اس آخری عروج کی جانب بھی نمایاں پیش قدمی ہوگئی جس کا کوئی سان گمان بھی ایک صدی قبل نہیں ہو سکتا تھا۔

یہی معاملہ موجودہ امتِ مسلمہ کے ساتھ پیش آیا کہ جہاں ایک جانب اس صدی کے آغاز میں سلطنتِ عثمانیہ اور خلافتِ اسلامی کے خاتمے' اور پھر ۱۹۶۷ء میں عربوں کی

عبرتناک ہزیمت اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی اور ۱۹۷۱ء میں "آخرین" کے اہم ترین اور عظیم ترین ملک یعنی پاکستان کی شکست و ریخت اور ان ہندوؤں کے ہاتھوں شرمناک ہزیمت کی صورت میں عذاب الٰہی کے سائے مزید گہرے ہوگئے جن پر مسلمانوں نے سینکڑوں برس حکومت کی تھی، وہاں دوسری جانب یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اس صدی کے ربعِ اول کے خاتمے کے لگ بھگ جب امت کے ایک حساس اور دردمند فرد کے دل کی گہرائیوں سے یہ درد انگیز صدا بلند ہوئی کہ ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

رحمتِ خداوندی میں جوش آچکا تھا اور تاریخ بالقوہ ایک کروٹ لے چکی تھی جس کے نتیجے میں پورے عالم اسلام میں ایک احیائی عمل شروع ہوگیا جس کا کسی قدر تفصیلی جائزہ بہت ضروری ہے تاکہ مایوسی کے سائے زیادہ گہرے نہ ہوں اور حالات کے تاریک رخ کے ساتھ ساتھ روشن پہلو بھی نگاہوں کے سامنے موجود رہے۔

اس احیائی عمل کے بارے میں بعض بنیادی حقائق ذہن نشین رہنے چاہئیں مثلاً ایک یہ کہ یہ کوئی سادہ اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد گوشے ہیں، جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرکار ہیں اور جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لئے باعث تقویت ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور ملتِ اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں مکمل ہونے والا نہیں بلکہ سورۃ الانشقاق کی آیت ۱۹: "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" یعنی "تم لازماً چڑھو گے درجہ بدرجہ" کے مصداق تدریجاً بہت سے مراتب و مراحل سے گزر کر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا لہٰذا اس ارتقائی عمل کا ہر درجہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور چاہے بعد کے مراحل سے گزر کر پہلوں کا کام بہت حقیر بلکہ کسی قدر غلط بھی نظر آئے اپنے اپنے دور کے اعتبار سے اس کی اہمیت و وقعت سے بالکلیہ انکار ممکن نہیں۔ تیسرے یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جدوجہد میں

اگرچہ افراد کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے بقول علامہ اقبال ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے مِلت کے مقدّر کا ستارا

تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہوجاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اس وسیع احیائی عمل کی پنہائیوں میں گم ہوجاتی ہیں جو ان سب کو محیط ہے۔

اس احیائی عمل کا اولین مرحلہ مسلمان اقوام کا مغربی استعمار کے براہِ راست تسلّط سے نجات کا حصول تھا جو بحمد اللہ گزشتہ چالیس پچاس سال کے دوران تقریباً مکمل ہوچکا ہے اور اگرچہ اب بھی ہم مغرب کی علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی غلامی میں مبتلا ہیں اور اقوامِ مغرب کی سائنسی و تکنیکی بالادستی کے باعث بہت سے پہلوؤں سے ان کے دست نگر بھی ہیں تاہم خدا کا شکر ہے کہ ایک قضیۂ فلسطین سے قطع نظر اور صرف کشمیر اور اریٹریا کے علاوہ پورے کرۂ ارضی پر مسلم اکثریت کا کوئی علاقہ براہ راست غلامی و محکومی کی لعنت میں گرفتار نہیں رہا۔

خالص اصولی و نظریاتی اور تصوریت پسندانہ نقطۂ نظر سے تو "مسلمان اقوام" کی اصطلاح ہی قطعاً غلط ہے' اس لئے کہ ازروئے قرآن و حدیث مسلمانوں کی حیثیت ایک جماعت یا اُمت یا حِزب کی ہے نہ کہ قوم کی لیکن واقعیت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک جماعت یا امت یا حزب کا کردار تو بہت پہلے ترک کردیا تھا اور بالفعل ایک قوم ہی کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ البتہ وحدتِ ملی کا تصور اس صدی کے آغاز تک برقرار تھا' لیکن اس صدی کے رُبعِ اول کے دوران مغربی استعمار کے ہتھکنڈوں نے اسے بھی ختم کرکے رکھ دیا تھا اور اِس وقت فی الواقع روئے ارضی پر کوئی ایک امتِ مسلمہ آباد نہیں ہے بلکہ بہت سی مسلمان اقوام آباد ہیں۔

اسی طرح خالص تصوریت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ع "نشّہ کو تعلق نہیں پیمانے سے" کے مصداق مسلمانوں کی آزادی اور خود مختاری کا احیائے اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے' لیکن واقعیت پسندانہ نگاہ سے دیکھئے تو مستقبل کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا' ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی علمبرداری کی سعادت کسی بالکل

ہی نئی قوم کے حوالے فرمادے اور "یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ" یعنی "بدل دے تمہاری جگہ کسی اور قوم کو" (سورۂ محمدؐ کی شان دوبارہ ظاہر ہو ـــــ لیکن بحالاتِ موجودہ توقع "کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے" کے مصداق اسلام کا مستقبل موجودہ مسلمان اقوام ہی کے ساتھ وابستہ ہے اور دونوں باہم لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اندریں حالات مسلمان اقوام کا آزادی و خود مختاری کی نعمت سے ہمکنار ہونا یقیناً احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ مشکل مرحلہ سر ہوا ہے ان کی سعی بھی اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ہی کی جدّوجہد کا جزو قرار پائے گی۔ رہا یہ شبہ کہ ان میں سے اکثر کے قائدین اور زعماء کا دین و مذہب کے ساتھ کوئی واقعی اور عملی تعلق نہ تھا تو اسی کا جواب ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ مبارکہ میں کہ "اِنَّ اللّٰہَ لَیُؤَیِّدُ ھٰذَا الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ" یعنی "یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت غیر متقی انسانوں سے بھی لے لیتا ہے" (بخاری کتاب الجہاد، عن ابی ہریرہؓ)

اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اگرچہ مختلف مسلمان ممالک میں حصولِ آزادی کی تحریکوں کی تقویت کے لئے جن علاقائی یا نسلی عصبیتوں کو استعمال کیا گیا انہیں بھی خاص اصولی اور نظری اعتبار سے اسلام کے نظامِ فکر کے ساتھ سوائے تضاد کے کوئی نسبت حاصل نہیں ہے لیکن عالمِ واقعہ میں اس کے سوائے کوئی چارۂ کار موجود نہ تھا، اس لئے کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا ذہنی و قلبی رشتہ اتنا قوی نہ رہا تھا کہ اسے کسی جاندار اور فعال تحریک کی اساس بنایا جاسکتا اور حصولِ استقلال کے لئے جس مؤثر مزاحمت کی ضرورت ہوتی ہے اس کی بنیاد خیالی یا جذباتی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی اساسات ہی پر رکھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر ترک نیشنلزم کا جذبہ فوری طور پر بیدار نہ ہوگیا ہوتا تو شاید آج ترکی کا نام و نشان بھی صفحۂ ارضی پر موجود نہ ہوتا۔ اسی طرح اسلام سے جتنا کچھ حقیقی اور واقعی تعلق اِس وقت مسلمانانِ عرب کو ہے وہ کسے معلوم نہیں، اندریں حالات عرب نیشنلزم ہی یورپی سامراج کے چنگل سے نکلنے کی جدّوجہد کے لئے واحد ممکن بنیاد بن سکتا تھا اور ایک وقتی ضرورت اور دفاعی تدبیر کی حد تک اس کے استعمال میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے، بشرطیکہ اسے نظامِ فکر کی مستقل اساس کے طور پر قبول نہ کرلیا جائے اور حصولِ آزادی کے عبوری مقصد کی تکمیل کے

بعد صحیح اسلامی فکر اور وحدتِ ملی کے شعور و احساس کو اجاگر کیا جائے۔

اس پس منظر میں دیکھئے تو تحریک پاکستان کا معاملہ بالکل منفرد نظر آتا ہے۔ برصغیر کے مسلمان بھی اگر برطانوی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہندی قومیت کی اساس پر غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرتے تو اس کے لئے بھی وجہِ جواز موجود تھی (چنانچہ جمعیت علمائے ہند کی سیاسی جدوجہد اسی اصول پر مبنی تھی، بلکہ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اپنی خود نوشت سوانح "نقشِ حیات" میں تو ثابت کیا ہے کہ خود مجاہدِ کبیر حضرت سید احمد بریلویؒ مسلمانانِ پنجاب کو "سکھا شاہی" سے نجات دلانے کے بعد اسی اساس پر انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے!) لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ یہاں کے مخصوص حالات کے باعث مسلمانانِ ہند نے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز "مسلم قومیت" کی اساس پر کیا جس کے نتیجے میں وہ ملک وجود میں آیا جو حضرت سلمان فارسیؓ کی طرح جو اپنا نام "سلمان ابن اسلام" بتایا کرتے تھے، صرف اور صرف "فرزندِ اسلام" قرار دیا جاسکتا ہے اور جس کے قیام کے لئے کوئی وجہ جواز سوائے اسلام کے موجود نہیں ہے۔ گویا پاکستان ع "خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ" کے مصداق اپنی پیدائش اور ہیئتِ ترکیبی کے اعتبار سے تمام مسلمان ممالک سے ایک قدم آگے ہے۔

مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد کو اس رخ پر ڈالنے والے اسباب و عوامل میں سلبی و منفی طور پر سب سے زیادہ دخل ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری اور تنگ دلی اور اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ شکست کا انتقام لینے کے اس جذبے کو حاصل ہے جو ان کے سینوں میں کھولتے ہوئے لاوے کی طرح پک رہا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو گویا ان کا یہ طرزِ عمل بھی اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے ممدّ و معاون بن گیا اور ہم اپنے سابق ابنائے وطن کی خدمت میں بجا طور پر عرض کرسکتے ہیں کہ ؎

تُو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لئے

مثبت اسباب کے ضمن میں ایک تو یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ مسلمانانِ ہند کے دلوں میں پہلے بھی جذبۂ ملی باقی تمام دنیا کے مسلمانوں سے زیادہ تھا جس کا سب سے

بڑا ثبوت یہ ہے کہ تنسیخِ خلافت پر جس قدر شدید ردِ عمل یہاں ظاہر ہوا اس کا عُشرِ عشیر بھی کہیں اور نہیں ہوا حتیٰ کہ ایک وقت تھا کہ برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں سب کی مشترک سیاسی جدوجہد کا عنوان ہی "تحریکِ خلافت" بن گئی تھی ------ اور دوسرے یہ کہ اس خطے میں علامہ اقبال مرحوم ایسی عظیم شخصیت پیدا ہوئی جس کی انتہائی پُردرد اور پُرتاثیر حدی خوانی نے قافلۂ ملی کو خوابِ غفلت سے بیدار کردیا اور مسلمانانِ ہند کو جذبۂ ملی سے سرشار کردیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ملّی شاعری کو اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کی وسیع الاطراف جدوجہد میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اور اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ۱۹۷۴ء میں عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس کا پاکستان اور خاص طور پر اس شہر لاہور میں انعقاد بہت معنی خیز تھا جہاں قریباً نصف صدی قبل قراردادِ پاکستان بھی منظور ہوئی تھی اور جہاں دورِ حاضر میں قافلۂ ملتِ اسلامیہ کا وہ سب سے بڑا حُدی خواں بھی مدفون ہے جو آخری دم تک یہ صدا لگاتا رہا کہ ؎

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم　　قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر　　دِلے در سینۂ مُلّا گدازیم

اس ہمہ جہتی احیائی عمل کا دوسرا اہم گوشہ وہ ہے جس میں علمائے کرام کی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں سرگرم کار اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف و مشغول ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی برصغیر ہندوپاک کو پورے عالمِ اسلام میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے، چنانچہ علماءِ دین کو جس قدر اثر و رسوخ یہاں کے مسلمان عوام پر حاصل ہے وہ دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتا اور راسخ العقیدہ اسلام جتنی مضبوط جڑیں یہاں رکھتا ہے کہیں اور نہیں رکھتا (۱۹۶۸ء میں جو ایجی ٹیشن ڈاکٹر فضل الرحمٰن مرحوم کی کتاب "اسلام" کے خلاف ہوا تھا اور پھر ۱۹۷۴ء میں جو معجزہ قادیانی مسئلے کے حل کی صورت میں صادر ہوا وہ اس کے منہ بولتے ثبوت ہیں) حتیٰ کہ جزیرہ نمائے عرب بھی، جہاں اس صدی کے وسط تک محمد ابن عبدالوہابؒ کی تجدیدی مساعی کے گہرے اثرات قائم رہے ہیں، اب اس معاملے میں بہت پیچھے رہ گیا ہے!

اس کی وجہ بھی بادنیٰ تأمل سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ یہ کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایسی جامع شخصیت گزشتہ تین سو سالوں کے دوران میں پورے عالمِ اسلام میں

پیدا نہیں ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کی توجہ علمِ دین کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث کی جانب منعطف کرانے کے ساتھ ساتھ فکرِ اسلامی کی تدوینِ نو کا جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں دین اور رجالِ دین کی ساکھ از سرِ نو مضبوط ہوگئی۔ اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ علماء دین کی مساعی میں اصل زور دورِ حاضر میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے دین کے نظامِ عقائد و اعمال کی حفاظت و مدافعت پر ہے۔ اس طرح ان کی خدمات کو سابق مجددینِ اسلام کی مساعی کے ساتھ ایک نوع کے تسلسل کی نسبت حاصل ہے، اس لئے کہ جملہ مجددینِ اُمت کی مساعی کی اصل نوعیت بھی احیاء دین یا اقامتِ دین کی نہیں بلکہ حفاظت و مدافعتِ دین ہی کی تھی اور یہ اس لئے کہ ابھی اسلام کا قصرِ عظیم بالکل زمین بوس نہیں ہوا تھا اور خواہ دین کی حقیقی روح کتنی ہی مضمحل اور پژمردہ ہوچکی ہو بہرحال اسلام نے جو تہذیبی اور قانونی نظام دنیا میں قائم کیا تھا اس کا ڈھانچہ برقرار تھا حتیٰ کہ شریعتِ اسلامی اکثر مسلمان ممالک میں بالفعل نافذ تھی۔ چنانچہ تمام تجدیدی مساعی کا اصل ہدف یہ رہا کہ دین کا نظامِ عقائد و اعمال محفوظ اور اپنی اصل صورت میں قائم رہے اور خارجی و بیرونی اثرات دین کو مسخ نہ کردیں۔

یہی وجہ ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دور تک کے تمام مجددینِ امت علیہم الرحمۃ کی مساعی اکثر و بیشتر علم و فکر کے میدان ہی تک محدود رہیں اور عقائد و نظریات کی تصحیح و اصلاح ہی کو ان کے اصل ہدف کی حیثیت حاصل رہی اور اس سے آگے اگر قدم بڑھا بھی تو زیادہ سے زیادہ اصلاحِ اخلاق و اعمال، تزکیۂ نفس اور تربیتِ روحانی تک۔ اس سے آگے بڑھ کر گزشتہ صدی سے قبل کسی بھی مجددِ دین کی جدوجہد نے سیاسی یا عسکری تحریک کی صورت اختیار نہیں کی۔

اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف "خروج" یعنی مسلح بغاوت پر نہایت سخت بندشیں عائد فرمادی تھیں اور جب تک ان کے ہاتھوں شریعتِ اسلامی کا نفاذ ہو رہا تھا اور کسی "کفرِ بواح" یعنی کھلے اور صریح کفر کی ترویج و تنفیذ نہیں ہو رہی تھی ان کے ذاتی فسق و فجور اور ظلم و جور کے باوجود ان کے خلاف مسلح بغاوت ممکن نہ تھی ------ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی یہ صورت حال تبدیل

ہوئی اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر مسلم اقوام کے ہاتھوں میں آئی دفعۃً ان مساعی میں عسکریت بھی پیدا ہوگئی جس کی سب سے شاندار اور تابناک مثال خانوادۂ ولی اللّٰہی کے زیر اثر برپا ہونے والی تحریکِ شہیدینؒ ہے۔

البتہ یہ حقیقت پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ عہد حاضر میں علماء کرام کی خدمات دو اعتبارات سے اصلاح طلب بھی ہیں: مثلاً ایک یہ کہ جب سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوا اور تقلیدِ جامد کا دور دورہ ہوا اور تشتت و انتشار اور فرقہ پرستی و گروہ بندی نے پاؤں جمالئے، ہر فرقے کے علماء کرام دین کے نظامِ عقائد و اعمال کی خاص اسی صورت کی حفاظت و مدافعت پر سارا زور صرف کر رہے ہیں جو ان کے مخصوص فرقے یا گروہ کے نزدیک معتبر و مستند ہے، جس سے فرقہ بندی کی جڑیں مضبوط تر ہوتی چلی جارہی ہیں۔ دوسرے چونکہ انہوں نے علومِ جدیدہ اور دورِ حاضر کے افکار و نظریات کا مطالعہ اس طرح براہ راست اور بالاستیعاب نہیں کیا جس طرح اپنے اپنے دور میں امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ نے کیا تھا لہٰذا وہ دورِ حاضر میں حفاظت و مدافعتِ دین کے اصل تقاضوں کو بھی صحیح طور پر پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ گویا دورِ حاضر میں علماءِ دین کی حیثیت دین کے جہاز کو آگے بڑھانے والی قوت فراہم کرنے والے انجن کی تو نہیں ہے البتہ کم از کم برصغیر پاک و ہند کی حد تک ایک ایسے بھاری لنگر کی ضرور ہے جو اس کشتی کو غلط رخ پر بڑھنے سے روکنے کی خدمت بہرحال سرانجام دے سکتا ہے اور فی زمانہ یہ بھی ایک اہم خدمت ہے۔

برصغیر میں اس سلسلے میں ایک اہم مقام اور مرتبہ دیوبندی مکتب فکر کو حاصل ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے "فکر" کا نہ سہی "علم" کا وارث ضرور ہے اور جس کی کوکھ سے دینی مدرسوں اور دارالعلوموں کے ایک عظیم سلسلے کے علاوہ ایک عظیم تحریک بھی برآمد ہوئی ہے جس نے راسخ العقیدہ اسلام کی جڑوں کی آبیاری کے ساتھ ساتھ توجہات کو حقائقِ ایمانی پر مرکوز کردیا اور جس کے زیر اثر کم از کم ایسے لوگ ضرور دین سے قریب ہو رہے ہیں جن کے اذہان فکری و نظری اشکالات سے خالی ہوتے ہیں اور جن کے قلوب میں نیکی کا ایک جذبہ خواہ نیم خوابیدہ حالت ہی میں سہی بہرحال موجود ضرور ہوتا ہے۔ ہماری مراد "جماعتِ تبلیغی" سے ہے جس نے اس دور میں دین و مذہب کے نام پر ایک عظیم حرکت عالم اسلام ہی نہیں، دیارِ غیر میں بھی برپا کردی ہے اور جس

کے زیر اثر عوامی سطح ہی پر سہی بہرحال "تجدید ایمان" کی ایک تحریک بالفعل برپا ہو گئی ہے اور جسے بلاشبہ زیر بحث ہمہ جہتی احیائی عمل میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ حال ہی میں بعض دوسرے مذہبی حلقوں نے بھی اسی طرز پر کام کا آغاز کر دیا ہے۔ اللہ کرے کہ اس سے فرقہ واریت کو فروغ نہ ہو بلکہ ایمان کی باطنی کیفیات اور شعائرِ اسلامی کی پابندی کو تقویت حاصل ہو۔

اس "ہمہ جہتی احیائی عمل" کا تیسرا اور اہم ترین گوشہ وہ ہے جس میں وہ جماعتیں اور تنظیمیں برسرِکار ہیں جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئیں اور جنہیں اب اس احیائی عمل کے اعتبار سے گویا مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے۔ مختلف مسلمان ممالک میں ایسی جماعتیں اور تنظیمیں مختلف ناموں کے تحت کام کرتی رہی ہیں لیکن۔ "ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم" اور "ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم" (جناب نعیم صدیقی) کے مصداق ان کی حیثیت ایک ہی تحریک کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہیئتوں کی ہے۔

ان جماعتوں میں اگرچہ ایک دور میں جوش اور جذبے کی شدت اور اثر و نفوذ کی وسعت کے اعتبار سے مصر کی الاخوان المسلمون توجّہات اور امیدوں کا مرکز بن گئی تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برِصغیر ہند و پاک ہی کو حاصل ہے۔

برصغیر میں اس تحریک احیائے دین کے مؤسّسِ اولین اور داعیٔ اول کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو حاصل ہے جنہوں نے اس صدی کے بالکل اوائل میں "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعے "حکومتِ الٰہیہ" کے قیام اور اس کے لئے ایک "حزب اللہ" کی تاسیس کی پرزور دعوت پیش کی۔ مولانا کے مخصوص طرزِ نگارش اور اندازِ خطابت نے، خصوصاً تحریکِ خلافت کے دوران میں، ان کی شہرت کو برصغیر کے طول و عرض میں پھیلایا اور ان کی دعوت نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کرلیا، لیکن اس کے بعد بعض وجوہ کی بناء پر، جن کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے، انہوں نے دفعتہً اس عظیم مشن کو خیرباد کہہ کر انڈین نیشنل کانگرس میں شمولیت اختیار کرلی اور باقی پوری زندگی پوری یکسوئی اور کمال مستقل مزاجی کے ساتھ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست کی نذر کردی۔ (راقم نے

اس موضوع پر مفصل بحث اپنی تالیف "جماعتِ شیخ الہندؒ" میں کی ہے)

اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم تو میدان چھوڑ گئے، لیکن ان کی زوردار دعوت کی گھن گرج سے مسلم انڈیا کی فضائیں دیر تک گونجتی رہیں اور پھر کم و بیش دس ہی سال بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے مولانا آزاد کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے ترک کردہ مشن کو اختیار کرنے کے عزمِ مصمّم کے ساتھ ان کی تفسیر "ترجمان قرآن" ہی کے ہم نام ماہنامے کی ادارت سنبھالی اور اس کے ذریعے اسی "حکومتِ الٰہیہ" کے قیام کا نصب العین اور "تجدید و احیائے دین" کی سعی کا ایک نقشہ مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کرنا شروع کردیا اور پہلے چھ سات برس تک پورے صبر و استقلال کے ساتھ خالص انفرادی طور پر کام جاری رکھا۔ پھر کچھ عرصہ "دارالاسلام" کے نام سے جو ادارہ علامہ اقبال کے ایک عقیدت مند چوہدری نیاز علی خاں نے قائم کیا تھا اس کے تحت کام کیا اور بالآخر ۱۹۴۱ء میں "جماعت اسلامی" کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھ دی اور ایک منظم جدوجہد کا آغاز کردیا۔

سب جانتے ہیں کہ کئی صدیوں سے عالم اسلام میں علمی و ثقافتی مراکز دو ہی رہے ہیں: عالمِ عرب میں مصر، اور غیر عرب مسلم دنیا میں ہندوستان۔ چنانچہ بیسویں صدی عیسوی کی احیائی تحریکیں بھی ان ہی دو ملکوں سے اٹھیں۔ لیکن تقریباً نصف صدی کے عرصے میں مصر کی تحریک اسلامی کے اثرات تمام عرب ممالک تک پہنچ گئے جن میں کم و بیش بیس پچیس کروڑ مسلمان آباد ہیں اور ہندوستان تو تھا ہی ایک برعظیم جس کے چار ٹکڑوں میں (اس لئے کہ اب کشمیر بھی بالقوہ تو بھارت سے جدا ہو ہی چکا ہے) لگ بھگ چالیس کروڑ مسلمان آباد ہیں جن کی نوجوان نسل کا معتدبہ حصہ تحریک اسلامی کے زیر اثر آیا ہے۔ ایران کا معاملہ خود اپنی جگہ ایک جداگانہ نوعیت کا حامل ہے۔ اس صدی کے آغاز تک وہ باقی مسلم دنیا سے الگ تھلگ گویا اپنے ہی خول میں بند تھا۔ پھر دوسرے ممالک کی احیائی تحریکوں کی فہرست میں ایران کے "فدائین" کا بھی ذکر سنائی دیا۔ لیکن اس کے بعد پھر کچھ خاموشی سی طاری رہی، تاآنکہ اچانک ایک طوفان کی سی کیفیت کے ساتھ ایران میں انقلاب آیا اور وہ بعض اعتبارات سے تو پوری مسلم دنیا سے آگے نکل گیا۔ مزید برآں ان تمام مسلمان ممالک سے جو نوجوان ساٹھ کی دہائی میں حصول تعلیم کے لئے امریکہ،

انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک گئے اور پھر وہیں آباد ہوگئے ان کے ذریعے ان تحریکوں کے اثرات مغربی دنیا میں بھی قابل لحاظ و احساس حد تک پہنچ چکے ہیں، چنانچہ مغرب ان ہی کو "مسلم فنڈا منٹلسٹ" کے نام سے پکار رہا ہے اور ان سے اپنی "مثالی" تہذیب و تمدن کو خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ (فرعون نے بھی سورۂ طٰہٰ کی آیت ۶۳ کی رُو سے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو اپنی "مثالی" تہذیب کے لئے خطرہ قرار دیا تھا) اور اس امر سے قطع نظر کہ ان تحریکوں کی نصف صدی سے زائد کی مساعی کا حاصل کیا ہے اور پالیسی اور طریق کار کے بارے میں اختلافات کے سبب سے یہ کتنی شاخوں میں تقسیم ہوئی ہیں، جیسے مثلاً عالمِ عرب میں مصر اور اردن میں بحیثیتِ مجموعی تو اِخوان نے پُرامن میانہ روی اختیار کی اور سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کو اپنی پیش رفت کا ذریعہ بنایا، لیکن ان ہی سے علیحدگی اختیار کرنے والے زیادہ ریڈیکل عناصر نے تشدّد اور دہشت گردی کا راستہ اختیار کرلیا جیسے مصر کی کچھ عرصہ قبل کی "التکفیر و الہجرہ" اور حالیہ "جماعہ اسلامیہ"۔ (اکتوبر ۷۹ء میں راقم نے قاہرہ میں اخوان کے مرشدِ عام عمر تلمسانی مرحوم سے ملاقات کی تھی تو انہوں نے تسلیم کیا تھا کہ "التکفیر و الہجرہ" اخوان ہی کے لوگ ہیں جو ہم سے علیحدہ ہوکر دہشت گردی کے راستے پر چل نکلے ہیں) اسی طرح اردن ہی کے تقی الدین نبہانی مرحوم نے کہیں زیادہ ریڈیکل "حزب التحریر" کی بنیاد رکھی۔ بہرحال یہ امر مسلم ہے کہ یہ تحریکیں مجموعی اعتبار سے عالمِ اسلام میں احیاءِ اسلام کی امنگ کا مظہر ہیں اور اب عالمی سطح پر انہیں ایک امرِ واقعی کی حیثیت سے تسلیم کیا جارہا ہے۔

الغرض، بیسویں صدی عیسوی میں ایک جانب تو سابقہ اور معزول شدہ امتِ مسلمہ یعنی یہود اور موجودہ امتِ مسلمہ یعنی مسلمانوں پر عذابِ الٰہی کے کوڑے بھی برستے رہے، لیکن دوسری جانب یہود کی بھی دو ہزار سالہ باسی کڑھی میں ابال آیا اور وہ صیہونی تحریک کی زیرِ قیادت "ارضِ موعود" میں قدم جماکر عظیم تر اسرائیل کے قیام اور ہیکلِ سلیمانی کی تعمیرِ نو کی جانب پیش قدمی کے لئے پر تول رہے ہیں، اور خود مسلمان بھی مغربی استعمار کی کم از کم براہ راست غلامی سے نجات پاکر (اس لئے کہ ابھی ریموٹ کنٹرول بہ تمام و کمال موجود ہے) اپنے دین کے احیاء اور اسلامی نظامِ حیات کے بہ وجوہ قیام ہی نہیں، عالمی غلبۂ دین کے خواب دیکھ رہے ہیں اور اس صدی کی آخری دہائی کے بقیہ حصے میں ہ

عظیم واقعات و حوادث رونما ہونے والے ہیں ان کی تہہ میں اصلاً ان ہی دو امتوں کی آخری آویزش کارفرما ہوگی۔ اگرچہ اس میں بظاہر زیادہ اہم اور نمایاں کردار ایک تیسری امت ادا کرے گی جو "ابراہیمی" مذاہب کے "ثالثُ ثلاثہ" یعنی تین میں کے تیسرے کی حیثیت رکھتی ہے' لہٰذا اس سے قبل کہ مستقبل کے واقعات و حوادث کے بارے میں کچھ بات کی جائے کسی قدر گفتگو اس تیسری امت کے بارے میں ضروری ہے۔

(یہ سلسلۂ مضمون ان شاءاللہ جلد ہی کتابی صورت میں شائع ہو جائے گا۔ ادارہ)

صدرِ مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی علمی و فکری اور دعوتی و تحریکی کاوشوں کا نچوڑ

۲۸۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم علمی دستاویز جس میں علمی خطوط کی نشاندہی بھی موجود ہے

دعوت

رجوعِ الی القرآن

کا منظر و پس منظر

ضرور مطالعہ کیجئے ـــــ دوسروں تک پہنچائیے

■ سفید کاغذ ■ عمدہ کتابت ■ دیدہ زیب طباعت ■ قیمت مجلد -/۸۰ روپے ■ غیر مجلد -/۶۰ روپے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے

ہمارے تعلّق کی بنیادیں

امیر تنظیم اسلامی وداعی تحریک خلافت

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک اہم خطاب

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ وَنُسَلِّمُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم○

اَمَّا بعدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم○

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم○

قال اللّٰہ عَزَّوَجَلَّ فِی القُرْاٰنِ المَجید:

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○

صدق اللّٰہ العظیم○○

ربیع الاول کے مہینہ میں چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تھی، لہٰذا اس مہینہ میں خاص طور پر سیرت کی مجالس اور جلسے منعقد ہوتے ہیں جن میں عموماً حضور ﷺ کی سیرۃ مطہرہ پر تقاریر ہوتی ہیں، آپ ﷺ کی خدمت میں سلام پڑھے جاتے ہیں اور نذرانۂ عقیدت کے طور پر نعتیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ اظہارِ محبت و عقیدت کے یہ طور طریقے اختیار کر کے ہم مسلمانوں کو عام طور پر یہ مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے کہ ہم نے بحیثیت امتی اپنی ذمہ داری پوری کر دی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں وہ ہم نے ادا کر دیئے۔ یہ جھوٹا اطمینان (Pseudo satisfaction) عام طور پر ہمیں اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا کہ ہم یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ از روئے قرآن حکیم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی حقیقی اساسات اور صحیح بنیادیں کیا ہیں؟ حالانکہ سیرت کی مجالس کا اصل حاصل یہ ہونا چاہئے کہ ہم یہ سوچیں اور طے کریں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت کیا ہے اور ہم سے خدا کے ہاں آنحضور ﷺ کے بارے میں کس بات کا محاسبہ ہو گا؟ پھر اس علم کی روشنی میں حضور ﷺ کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیادوں پر استوار کریں اور اس ضمن میں جہاں جہاں کمی اور جس جس پہلو سے کوتاہی نظر آئے اس کا ازالہ کرنے کی پوری پوری کوشش کریں۔ اگر ہم یہ ارادہ لے کر سیرت کی کسی مجلس میں شریک ہوں اور ایسا کوئی عزم لے کر وہاں سے اٹھیں تو یہ یقیناً فائدے کی بات ہے اور آخرت کے اعتبار سے نفع بخش ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نسبت کے تقاضوں کو واضح کرنے کے لئے میں اس موضوع پر قدرے تفصیل سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ از روئے قرآن مجید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی صحیح بنیادیں کیا ہیں۔ اس کے لئے میں نے سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کا آخری جزو منتخب کیا ہے:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

"پس جو لوگ ایمان لائے ان (نبی اکرم ﷺ) پر اور جنہوں نے انؐ کی توقیر و تعظیم کی، اور جنہوں نے انؐ کی مدد اور حمایت کی (یعنی انؐ کے مشن میں انؐ کے دست و بازو بنے، اور انؐ کے مقاصد کی تکمیل میں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھپایا) اور جنہوں نے اس نور کا اتباع کیا جو انؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، تو یہی ہیں وہ لوگ جو فلاح پانے والے ہیں۔"

جس آیتِ کریمہ کا آخری جزو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے وہ پوری آیت اگر سامنے ہو تو معلوم ہو گا کہ اس میں اصل تخاطب اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے ہے اور ان کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ یہی وہ "الرَّسُولَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ" ہیں جن کے بارے میں پیشین گوئیاں تمہاری کتابوں تورات اور انجیل میں موجود ہیں اور جن کی آمد کی خوش خبری انبیاء سابقین دیتے چلے آ رہے تھے۔ ہمارے یہ رسول (ﷺ) تمہارے پاس آ گئے ہیں، یہ تم کو نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں، تمہارے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دے رہے ہیں، اور تم نے شریعت کے نام سے اپنے اوپر جو بیجا وزن اور بوجھ لاد رکھے ہیں اور رسوم و قیود کی جو بیڑیاں پہن رکھی ہیں، ان سے تم کو نجات دلا رہے ہیں ------ اس کے بعد اس آیت میں وہ الفاظ آئے ہیں جو اس وقت ہمارے زیرِ مطالعہ ہیں:

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ○

آیتِ کریمہ کے اس حصہ پر غور کرنے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق کی چار بنیادیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

- پہلی یہ کہ حضور ﷺ پر ایمان لایا جائے، آپ کی تصدیق کی جائے۔
- دوسری یہ کہ حضور ﷺ کی توقیر و تعظیم کی جائے۔
- تیسری یہ کہ حضور ﷺ کی نصرت و حمایت کی جائے۔
- چوتھی یہ کہ حضور ﷺ پر جو نورِ ہدایت یعنی قرآن مجید نازل ہوا ہے اس کی پیروی کی جائے، اور اپنی زندگی کے ہر عمل کے لئے اس مینارۂ نور سے ہدایت و رہنمائی حاصل کی جائے۔

اب میں چاہوں گا کہ ان چاروں بنیادوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ کچھ وضاحتیں پیش کر دی

جائیں، جو اگرچہ تفصیل کی متقاضی ہیں لیکن میں کوشش کروں گا کہ اختصار کے ساتھ وہ باتیں بیان کردی جائیں جو ہمارے لئے غور و فکر کی راہیں کھول سکیں۔

۱۔ ایمان

متذکرہ بالا آیت کے حوالے سے جو سب سے پہلی بات ذہن نشین کرنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی اولین اور بنیادی نوعیت یہ ہے کہ ہم آپؐ پر ایمان لاتے ہیں اور آپؐ کی تصدیق کرتے ہیں۔ نیز آپؐ کو اللہ کا نبی، اللہ کا رسول، اللہ کا فرستادہ اور اللہ کا پیغامبر تسلیم کرتے ہیں۔ اس اقرار و یقین کا نام "ایمان" ہے اور اسی سے ہمارے اور حضور ﷺ کے مابین ایک تعلق اور رشتہ کا آغاز ہوتا ہے۔ امتِ مسلمہ میں اگرچہ سادات اور ہاشمی بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں، لیکن عظیم اکثریت یقیناً ان لوگوں کی ہے جن کا کوئی نسل اور خون کا تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں ہے۔ بایں ہمہ ہر امتی کو حضور کے ساتھ ایک نسبت و تعلق حاصل ہے اور یہی تعلق سب سے اہم اور سب سے مضبوط تعلق ہے، یعنی ایمان کا تعلق، اس یقین کا تعلق کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں جو پورے عالم کے لئے ہادی و رہنما بنا کر مبعوث کئے گئے اور جو تمام بنی نوع آدم کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے۔ بمفہوم الفاظِ قرآنی: وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا (سبا:۲۸) "اور (اے نبیؐ) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لئے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا (بنا کر)"

اکثر و بیشتر حضرات کے علم میں ہو گا کہ اس ایمان کے دو درجے ہیں۔ ایمان مجمل کے الفاظ میں ان دو درجوں کے لئے دو اصطلاحیں آئی ہیں، ایک اِقرارٌ بِاللِّسان اور دوسری تَصدیقٌ بِالقلب۔ یعنی حضور ﷺ پر ایمان کے ضمن میں زبان سے اس امر کا اقرار کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور دل سے اسی بات کی تصدیق اور اسی پر یقینِ کامل رکھنا۔ ان کو آپ ایمان کے دو درجے، دو مراتب، یا دو پہلو کہہ سکتے ہیں اور جب یہ دونوں باہم دگر ایک وحدت بنیں گے تب ہی درحقیقت ایمان مکمل ہو گا۔ اگر صرف زبان سے اقرار ہے لیکن دل میں یقین نہیں تو یہ ایمان نہیں، بلکہ اسے نفاق کہا جائے گا۔ مدینہ طیبہ کے منافقین زبان سے حضور ﷺ پر ایمان لانے کا اقرار کرتے تھے، بلکہ آپؐ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے

تھے، زکوٰۃ ادا کرتے تھے، لیکن ان کے دل نورِ یقین سے خالی تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا ٹھکانا جہنم قرار پایا، بلکہ جہنم کا بھی سب سے نچلا حصہ۔ ازروئے الفاظ قرآنی: "اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ" یعنی "یقیناً منافق تو آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے"۔ اسی طرح کوئی شخص دل میں تو حضور ﷺ کی رسالت کا یقین رکھتا ہو، لیکن زبان سے اس کا اقرار نہ کرے تو قانونِ شریعت کی رُو سے ایسا شخص کافر قرار پائے گا۔ دنیا میں وہی شخص مسلم قرار پائے گا جو زبان سے کلمۂ شہادت کا اقرار کرے کہ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اور آخرت میں وہی شخص مومن قرار پائے گا جو اقرار باللسان کے ساتھ تصدیق بالقلب کی دولت سے بھی مالا مال ہو، جو دل والے یقین کے ساتھ یہ ایمان رکھتا ہو کہ بے شک محمد (ﷺ) بن عبداللہ بن عبدالمطلب، اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں، اور ان پر اللہ کی آخری کتاب نازل ہوئی ہے جو ابدالآباد تک محفوظ رہے گی۔ غرضیکہ اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب لازم و ملزوم ہیں اور ایمان کی تکمیل ان دونوں کے ارتباط و اشتراک سے ہوگی۔

۲- توقیر و تعظیم

ایمان کے دونوں درجوں کو لازم و ملزوم سمجھنے سے یہ بات خود بخود منطقی طور پر سمجھ میں آ جائے گی کہ ایمان جب یقینِ قلبی کے درجے تک پہنچتا ہے تو اس کے نتیجے کے طور پر انسان کے عمل میں کچھ اثرات لازماً پیدا ہونے چاہئیں ---- اس ایمان کا پہلا لازمی نتیجہ تو وہ ہے جو اسی آیت میں ایمان کے ذکر کے بعد "عَزَّرُوْہُ" کے الفاظ میں آیا ہے۔ "فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ" یعنی "پس وہ لوگ جو محمد ﷺ پر ایمان لائے اور جنہوں نے ان کی توقیر و تعظیم کی"۔ گویا ایمان کا پہلا تقاضا توقیر و تعظیم ہے۔ جب حضور ﷺ کے بارے میں یہ یقین حاصل ہو گیا کہ آپ ہمارے خالق، ہمارے مالک، ہمارے آقا اور ہمارے پروردگار کے فرستادہ ہیں، اس کے پیغامبر ہیں، اس کے رسول ہیں، جنہیں اس نے ہماری ہدایت و رہنمائی کے لئے مبعوث فرمایا ہے، اور حضور ﷺ نے جو کچھ پیش فرمایا ہے، جو تعلیم دی ہے، جو احکام دیئے ہیں، جو خبریں دی ہیں، جو اوامر و نواہی بتائے ہیں، حلال و حرام کی جو قیود عائد فرمائی ہیں، ان میں سے کوئی بات بھی انہوں نے اپنے جی سے پیش نہیں کی ہے بلکہ ہر بات اللہ کی طرف سے پیش

فرمائی ہے، جیسا کہ سورۃ النجم میں ارشاد ہوا: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ "اور یہ (رسول ﷺ) اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتے۔ یہ تو صرف وحی ہے جو (ان پر) بھیجی جاتی ہے"۔ پس معلوم ہوا کہ ایمان کا پہلا فطری اور لازمی نتیجہ حضور ﷺ کی توقیر و تعظیم اور آپ کا ادب و احترام ہے۔

سورۃ الحجرات میں اس ادب و احترام اور توقیر و تعظیم کی شرح بیان ہوئی ہے جو مسلمانوں سے مطلوب ہے اور جو انہیں ملحوظ رکھنا چاہئے۔ چنانچہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ (آیت ۲)

"اے ایمان والو! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اور نہ ان سے گفتگو میں آواز کو اس طرح بلند کیا کرو جس طرح تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی آواز بلند کرتے ہو، مبادا تمہارے اعمال برباد ہو جائیں، اور تمہیں شعور تک نہ ہو"۔

شعور و احساس تو اسی وقت ہوتا ہے جب انسان یہ سمجھے کہ وہ حضور ﷺ کی کسی نافرمانی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ غور کیجئے کہ یہاں رسول ﷺ کی نافرمانی اور معصیت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوا بلکہ مجرد سوئے ادب کی وجہ سے سارے نیک اعمال اکارت ہونے کی وعید سنائی جا رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی اور حکم عدولی اور حضور ﷺ کی رائے کو پس پشت ڈال دینا تو بڑی دور کی بات ہے، جس کے معصیت ہونے میں کوئی کلام نہیں، محض یہ سوئے ادب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کر دیا جائے تو اس پر کیسی دھمکی دی گئی ہے اور کیسی زبردست تنبیہہ کی گئی ہے کہ حضور ﷺ کے معاملے میں ایسی بے احتیاطی برتنے کے سبب سے اب تک کے تمام کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا، تمہاری سب نیکیاں برباد ہو جائیں گی اور تمہیں معلوم تک نہ ہو گا کہ تم نے اس بے ادبی اور بے احتیاطی سے کیا کچھ کھو دیا اور تم کیسے عظیم نقصان اور خسارہ سے دوچار ہو گئے۔ اس لئے کہ تم اس مغالطہ میں رہو گے کہ ہم نے حضور ﷺ کی کوئی حکم عدولی تو نہیں کی اور ہم سے کسی معصیتِ صریحہ کا ارتکاب تو نہیں ہوا۔ سورۃ الحجرات کی اس آیتِ مبارکہ سے یہ با

واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ایمان بالرسالت کا پہلا لازمی نتیجہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب و احترام اور آپ کی توقیر و تعظیم ہے۔

اب اسی ایمان کے دو مضمرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو مشہور احادیث کے حوالہ سے آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں --- ان میں سے ایک ہے اطاعتِ رسول ﷺ اور دوسرا ہے محبتِ رسول ﷺ۔

اطاعت

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُم حَتّٰی یَکُونَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِہٖ

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اُس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں"۔

یہ حدیث مشکوٰۃ المصابیح میں "شرح السنہ" کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد جب تک ان تمام احکامِ شریعت، حدود و قیود اور اوامر و نواہی کو دلی آمادگی کے ساتھ تسلیم نہیں کیا جاتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن و سنت کے ذریعے سے پیش فرمائے ہیں اور جب تک اپنے نفس کی خواہشات کو کچلتے ہوئے قرآن و سنت پر عمل کا جذبہ بیدار نہیں ہوتا تب تک ایمان کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی کامل اطاعت اور قرآن و سنت کے احکام پر سرِ تسلیم خم کرنا ایمان بالرسالت کی شرطِ لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ کی اطاعت کا حکم ملے گا وہاں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم بھی ساتھ ہی موجود ہو گا۔ مثلاً سورۂ آل عمران (آیت ۳۲) میں ارشاد ہوا: قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ۔ اسی طرح سورۃ التغابن (آیت ۱۲) میں فرمایا گیا: وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔ یعنی "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی"۔ جب محمد ﷺ کو اللہ کا رسول اور اس کا نمائندہ مان لیا ہے تو اب تمہارے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ تمہیں ان کا ہر حکم ماننا پڑے گا اور ہر ارشاد کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہو گا۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ جس رسول کو بھی بھیجتا ہے اس حکم کے ساتھ بھیجتا ہے

کہ اس کی اطاعت کی جائے' جیسا کہ سورۃ النساء (آیت ۶۴) میں فرمایا: وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ "اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے"۔ اسی سورۂ مبارکہ میں آگے فرمایا: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (آیت ۸۰) "جس شخص نے رسول کی اطاعت کی' اس نے اللہ کی اطاعت کی"۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ حکم دینے کے لئے ہمارے پاس خود نہیں آتا' اس نے اپنے احکام ہم تک پہنچانے کے لئے انبیاء و رسل کو واسطہ بنایا ہے' لہٰذا اب خدا کی اطاعت کا ذریعہ بھی رسول کی اطاعت ہے۔ اسی بات کو حضور ﷺ نے اس طرح فرمایا کہ مَن اَطاعَنِی فقد اطاع اللّٰہَ وَمن عصانی فقد عَصَی اللّٰہَ "جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی" (متفق علیہ' عن ابی ہریرہؓ)

نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کے لزوم کے لئے سورۃ النساء کی آیت ۶۵ بھی پیش نظر رہنی چاہئے۔ فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ○

"پس نہیں' آپ کے رب کی قسم! یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہوں گے جب تک اپنے نزاعات میں آپ ہی کو حکم نہ مانیں' پھر آپ جو فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے پوری خوش دلی کے ساتھ قبول کرلیں"۔

یہ آیتِ مبارکہ حضور ﷺ کے واجب الاطاعت ہونے کے لئے نصِ قطعی ہے۔ رسولؐ محض مان لینے کے لئے نہیں بھیجا جاتا بلکہ وہ اس لئے مبعوث کیا جاتا ہے کہ اس کی کامل اطاعت کی جائے' اس کے تمام فیصلے تسلیم کئے جائیں' اس کے جملہ احکام کی تعمیل کی جائے' اس کی سنت کی پیروی کی جائے اور اس کے نقش قدم کو رہنما بنایا جائے۔ حضور ﷺ کو صرف مرکزِ عقیدت سمجھ لینا ہرگز کافی نہیں بلکہ ایمان اور توقیر و تعظیم کے لازمی عملی نتیجہ کے طور پر آپ کو مرکزِ اطاعت تسلیم کرنا ضروری ہے۔ اس اطاعتِ کلی کے بغیر ایمان کا اقرار ایک زبانی دعویٰ تو قرار پائے گا' لیکن یہ حقیقی ایمان کے اعتبار سے خدا کے ہاں معتبر نہیں ہوگا۔

محبت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کی توقیر و تعظیم کا دوسرا لازمی نتیجہ آپؐ سے

محبت ہے۔ صرف زبردستی' مجبوری اور مارے باندھے کی اطاعت تو کسی جابر حکمران اور جابر اقتدار کی بھی کی جاسکتی ہے بلکہ کی جاتی ہے۔ لیکن جب یہ اطاعت رسول ﷺ کے لئے مطلوب ہو تو پھر زبردستی کی اطاعت نہیں' بلکہ وہ اطاعت مطلوب ہوتی ہے جو انتہائی گہری محبت' دل کی پوری آمادگی اور پورے انبساطِ قلب اور شرحِ صدر کے ساتھ ہو' کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی محبت لوازمِ ایمان میں سے ہے۔ اس ضمن میں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

لَایُؤمِنُ احدُ کم حتّٰی اکون احبَّ الیہ مِن والدہٖ وولدہٖ والنَّاسِ اَجْمَعین (متفق علیہ' عن انس بن مالکؓ)

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے لئے اس کے باپ' اس کے بیٹے اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جاؤں"۔

یعنی اگر ایک مسلمان کے دل میں حضور ﷺ کی محبت اپنے تمام اعزہ و اقارب اور تمام انسانوں سے بڑھ کر جاگزیں نہیں ہوئی ہے تو وہ شخص حقیقتاً مومن نہیں۔ حدیثِ مبارک کے الفاظ میں کوئی ابہام نہیں ہے' بلکہ بڑے واضح الفاظ میں صاف صاف اور دو ٹوک انداز میں ایسے شخص کے ایمان کی نفی کر دی گئی ہے جسے نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی دنیا کے تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہیں ہے۔ اگر نبی اکرم ﷺ کی محبت تمام محبتوں پر غالب نہیں آتی تو در حقیقت آپ پر صحیح معنوں میں وہ ایمان ہی حاصل نہیں ہوا جو خدا کے ہاں معتبر ہے اور جس کی بنیاد پر اس کی عدالت سے جزا و سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔

اس ضمن میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے ان سے سوال کیا: "عمرؓ تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟" ذرا اندازہ لگائیے کہ اس گفتگو سے کس قدر اپنائیت کا احساس ابھرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مابین کس قدر قلبی و ذہنی قرب موجود تھا۔ سوال کا انداز خود بتا رہا ہے کہ یہ سوال اسی ہستی سے کیا جاسکتا ہے جس کی محبت اور شیفتگی مسلم ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواباً عرض کیا کہ " حضور آپ مجھے دنیا کے ہر انسان اور ہر شے سے زیادہ محبوب ہیں"۔ حضور ﷺ نے پھر دریافت فرمایا: "اور خود اپنی جان سے بھی؟" اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کچھ توقف کیا اور پھر عرض کیا: "اَلآنَ" یعنی ہاں حضور اب میں یہ بھی کہتا ہوں کہ آپؐ مجھے میری

جان سے بھی زیادہ محبوب اور عزیز ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے سوال کا جواب سوچ سمجھ کر، اپنا جائزہ لے کر اور اپنے دل کے اندر جھانک کر دیا۔ ہمارے نعت گو حضرات کی طرح نہیں کہ زبانی جمع خرچ کرنے پر ہی اکتفا ہو اور دعویٰ محبت میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے جائیں، الا ماشاء اللہ۔ حضرت عمرؓ کا جواب سن کر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں اب تم مقامِ مطلوب تک پہنچے ہو۔ یعنی اگر میں تمہیں ہر چیز، ہر انسان یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی محبوب تر ہو گیا ہوں تو اب وہ صحیح تعلق پیدا ہوا جو اللہ کو مطلوب ہے۔

اتباع

دل کی حقیقی محبت، طبیعت کی پوری آمادگی اور ایک گہرے قلبی لگاؤ کے ساتھ جب انسان کسی کی پیروی کرتا ہے تو وہ صرف اس حکم ہی کی پیروی نہیں کرتا جو وہ اپنی زبان سے واضح الفاظ میں دے رہا ہو، بلکہ وہ اس کی ہر ادا کی پیروی کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتا ہے اور اس کے چشم و ابرو کے اشاروں کا منتظر رہتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ میرے محبوب کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند، ان کی نشست و برخاست کا طریقہ کیا ہے، ان کی گفتگو کا انداز کیا ہے، چلتے کس طرح ہیں، وہ لباس کون سا پہنتے ہیں، انہیں کھانے میں کیا چیز مرغوب ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں خواہ کبھی کوئی حکم نہ دیا گیا ہو، لیکن جس کے دل میں کسی کی حقیقی محبت جاگزیں ہو جائے، جو کسی کا والہ و شیفتہ ہو جائے، اس کے لئے وہ احکام جو الفاظ میں دیئے گئے ہوں، زبان سے ارشاد فرمائے گئے ہوں یا وہ کام جن کے کرنے کی ترغیب و تشویق دلائی گئی ہو ان کا تو کہنا ہی کیا، وہ تو ہیں ہی واجب التعمیل، ایسے شخص کے لئے تو چشم و ابرو کا اشارہ بھی حکم قطعی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی ہر ہر ادا کی نقالی اور اس کے ہر قدم کی پیروی وہ اپنے اوپر لازم کر لیتا ہے۔ گویا:۔

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

اس طرزِ عمل کا نام "اِتباع" ہے جس کی بڑی تابناک مثالیں ہمیں صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں نظر آتی ہیں۔ سیرت کی کتابوں میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بہت سے واقعات مرقوم ہیں جن سے ان کے جذبۂ اتباع کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک سفر میں حضور ﷺ کے ساتھ تھے، اتفاق سے حضور ﷺ کا گزر ایک خاص درخت کے نیچے سے ہوا، لیکن حضرت ابن عمرؓ نے ہمیشہ کے لئے لازم کر لیا کہ جب کبھی ان کا اس راستہ سے گزر ہوتا تو وہ اس

درخت کے نیچے سے ہو کر گزرتے۔ اسی طرح حجتہ الوداع کے سفر میں حضور ﷺ نے دورانِ سفر جہاں جہاں پڑاؤ کیا، جہاں جہاں استراحت فرمائی، اور جہاں حوائج ضروریہ سے فراغت پائی، حضرت ابن عمرؓ نے سفرِ حج میں انہی مقامات پر پڑاؤ، استراحت اور رفعِ حاجت کا التزام کیا، حالانکہ انہیں حضور ﷺ کی طرف سے ایسا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا اور شریعت کے لحاظ سے آپ ﷺ کے یہ اعمال واجب التعمیل بھی نہیں تھے، بلکہ خالص عقلیت پسند (RATIONALIST) لوگ تو شاید اس کو جنون اور خواہ مخواہ کا FANATICISM کہیں۔ لیکن یہ معاملہ عشق و محبت کا معاملہ ہے جس میں محبوب کے ہر نقشِ قدم کی پیروی دستورِ محبت شمار ہوتی ہے۔ اگر کوئی فنائی حُبِّ الرسول ہو جائے تو اس کا طرزِ عمل اور رویہ یہی ہونا چاہئے۔ اسی طرح سیرِ صحابہؓ میں ایک صحابیؓ کا ذکر ملتا ہے جو کسی دور دراز علاقہ سے آ کر حضور ﷺ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوئے تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ کو بس اسی ایک موقع پر دیکھا تھا اور اتفاق سے اُس وقت حضور ﷺ کا گریبان کھلا تھا۔ آپ ﷺ کو کھلے گریبان کے ساتھ دیکھ کر ان صحابیؓ نے پھر ساری عمر اپنے گریبان کے بٹن نہیں لگائے، اس لئے کہ انہوں نے محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی حال میں دیکھا تھا۔ حالانکہ حضور ﷺ کی طرف سے انہیں ایسا کوئی حکم تو کجا، کسی ادنیٰ درجے میں اشارہ تک نہیں کیا گیا، اور شریعت کی رُو سے یہ نہ فرض ہے نہ واجب، لیکن یہ محبت کے لوازم میں سے ہے کہ محبوب کے ہر نقشِ قدم کی پیروی اور ہر ادا کی نقالی اپنے اوپر لازم کرلی جائے۔ اسی طرزِ عمل کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں اتباع ہے۔

اتباعِ رسول کا قرآن مجید میں جو مقام ہے وہ سورۂ آل عمران کی آیت ۳۱ کے مطالعہ سے سامنے آتا ہے۔ فرمایا گیا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○

"(اے نبی ﷺ) آپ فرمادیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو، (اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ) اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں کو معاف فرما دے گا، اور اللہ بہت معاف کرنے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے"۔

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا لازمی تقاضا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہے۔ اس اتباع کا ایک نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ ہم اللہ کی محبت میں پختہ تر اور مضبوط تر ہوتے چلے جائیں گے اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اللہ کے محبوب اور اس کی مغفرت و رحمت کے سزاوار قرار پائیں گے۔ جن کو یہ مرتبہ مل جائے کہ وہ اللہ کے محبوب قرار پائیں ان کی خوش نصیبی اور خوش بختی کا کیا کہنا!

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پیشتر ہم اب تک کی گفتگو کے اہم نکات کا اعادہ کر لیں اور اس کے لب لباب کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی اولین اور اہم ترین بنیاد حضور ﷺ پر ایمان لانا ہے۔ اس ایمان کا زبانی اقرار بھی ضروری ہے اور قلبی یقین بھی۔ پھر ایمان کا اولین تقاضا حضور ﷺ کی توقیر و تعظیم اور آپ کا کماحقہ ادب و احترام ہے۔ آپ پر ایمان اور آپ کی توقیر و تعظیم کے دو ناگزیر لوازم ہیں۔ ایک اطاعت کلی اور دوسرے محبت قلبی جو ہر دوسری چیز کی محبت پر غالب ہو۔ اور جب یہ دونوں جمع ہوں گی تو اس کا نام "اتباع" ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اصلاً یہی مطلوب ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں اس کے بارے میں فرمایا گیا کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو نبی اکرم ﷺ کا اتباع اپنے اوپر لازم کر لو' اس کے نتیجے میں اللہ تم سے محبت کرے گا' تم اللہ کے چہیتے بن جاؤ گے اور وہ تمہارے گناہ بھی معاف فرما دے گا۔

یہاں پر اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ایمان اور توقیر و تعظیم کے ان دونوں ناگزیر لوازم میں سے اگر ایک بھی غائب ہو تو اس ادھورے طرز عمل سے آخرت میں نجات کی توقع ایک امیدِ موہوم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اگر حضور ﷺ پر ایمان کا دعویٰ بھی ہے' اس کے ساتھ ساتھ مارے باندھے کی اطاعت بھی ہو رہی ہے' لیکن محبت نہیں ہے' اطاعت میں دلی آمادگی نہیں ہے' یُسَلِّمُوا تَسْلِیمًا کی کیفیت نہیں ہے' دل میں تنگی اور اپراہٹ ہے' تو اس طرز عمل میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کے دور کے منافقین بھی ایمان لانے کے مدعی تھے اور وہ آپؐ کی اطاعت بھی کرتے تھے' لیکن یہ ان کی مجبوری تھی۔ وہ معاشرہ آج جیسا تو نہیں تھا کہ مسلمان کہلانے والے اطاعتِ رسول ﷺ تو درکنار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا استہزاء کریں' جنت و دوزخ اور جزا و سزا کا مذاق اڑائیں' ملائکہ اور نزولِ وحی کے منکر ہوں' سنتِ رسول ﷺ

کے التزام سے انکار کریں اور اسلام کے نظامِ زندگی کو آج کے دور کے لئے ناقابلِ عمل قرار دیں، لیکن پھر بھی مسلمان کہلائیں اور ان کا شمار مسلمانوں میں کیا جائے۔ اس معاشرہ کا حال تو یہ تھا کہ جس کسی نے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا تھا اور خود کو مسلمان کہلانا تھا اس کے لئے اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت سے سرتابی ممکن ہی نہیں تھی۔ وہ اس پر مجبور تھا کہ نماز پڑھے، شعائرِ دین کا احترام کرے اور فرائضِ دین کی ادائیگی کا اہتمام کرے۔ لہٰذا منافقین یہ سارے جتن کرتے تھے بلکہ قسمیں کھا کھا کر حضور ﷺ کو اپنے صادق و مخلص ہونے کا یقین دلاتے تھے، لیکن ان کو جو متاعِ عزیز حاصل نہیں تھی، وہ تھی یقینِ قلبی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حضور ﷺ سے حقیقی و واقعی محبت۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ المنافقون میں فیصلہ فرمادیا کہ:

اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوْلُهٗ ۘ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ ۝

"(اے نبی ﷺ) جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق بلاشبہ (اپنے قول میں) جھوٹے ہیں"۔

یعنی ان کی یہ بات تو اپنی جگہ سچی اور صداقت پر مبنی ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، لیکن چونکہ یہ دل سے آپؐ کی رسالت کے قائل نہیں، ان کے دلوں میں آپؐ کی حقیقی محبت موجود نہیں، صرف زبان سے اقرار کرتے ہیں، ان کا باطن کچھ اور ہے اور ظاہر کچھ اور، اس لئے یہ جھوٹے ہیں اور ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ قلبی یقین اور محبت کے بغیر اگر اطاعت ہو رہی ہو تو اس میں منافقین کے ساتھ ایک مشابہت پیدا ہوتی ہے۔

اس کے برعکس اگر یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے کہ محبت رسولؐ کے محض دعوے ہیں لیکن اطاعت نہیں، فرائض کی ادائیگی نہیں، اوامر و نواہی کی پرواہ نہیں، احکامِ شریعت کا سرے سے کوئی لحاظ نہیں، تو یہ طرزِ عمل سراسر معصیت اور فسق و فجور پر مبنی ہے۔ محبت کا یہ خالی خولی دعویٰ اللہ کے ہاں سرے سے قبول ہی نہیں ہوگا۔ ایسا دعویٰ تو اس دنیا میں بھی قبول نہیں ہو سکتا بلکہ مہمل قرار پاتا ہے کہ ایک طرف محبت کا دعویٰ ہو اور دوسری طرف اطاعت اور رضا جوئی کا سرے سے کوئی اہتمام نہ ہو۔ کسی بیٹے کو والد کی محبت کا دعویٰ ہو، لیکن وہ ان کا کہنا نہ

مانتا ہو بلکہ ہر عمل والد کی مرضی کے خلاف انجام دیتا ہو تو معقول بات یہ ہے کہ بیٹے کے اس دعوئ محبت کو دنیا میں کہیں تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح عشقِ رسول ﷺ اور محبتِ رسول ﷺ کے بلند بانگ دعاوی، بڑی وجد آفریں نعتیں اور بڑے لمبے چوڑے سلام، بڑے جوش و خروش اور شان و شوکت سے نکالے ہوئے جلوس اور بڑے ہی اہتمام کے ساتھ منعقد کی ہوئی میلاد کی محفلیں اور مجالسِ سیرت اگر جذبۂ اطاعت سے خالی اور پیروئ سنّت کے جذبہ سے عاری ہیں تو یہ سب کچھ سراپا ڈھونگ ہے، فریبِ نفس ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں، میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں، بلکہ یہ سب قابلِ مواخذہ ہیں۔

۳۔ نصرتِ رسول ﷺ

آیت زیرِ مطالعہ میں نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد "وَنَصَرُوْهُ" کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے، یعنی "جن لوگوں نے حضور ﷺ کی مدد اور حمایت کی"۔ اس موضوع پر آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں یہ بات طے کرنی چاہئے کہ رسول ﷺ کی نصرت و حمایت اور ان کی مدد کس کام میں اور کس مقصد کے لئے مطلوب ہے۔ نبوت و رسالت ایک فریضۂ منصبی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء و رسل کو تفویض کیا جاتا ہے۔ یعنی بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ دکھانا، نیند کے ماتوں کو جگانا، انسان کو شرک کے اندھیاروں میں سے نکال کر توحید کے روشن صراطِ مستقیم پر لا کھڑا کرنا، اسے اعمالِ صالحہ اور مکارمِ اخلاق کا خوگر بنانا، انسان پر سے انسان کی خدائی کو ختم کرنا، معاشرہ میں سے ہر قسم کے جور و استبداد اور استحصال کا خاتمہ کرنا، اور انسان کو یہ یقین دلانا کہ ایک دن وہ بھی آنے والا ہے کہ جس روز انسان کو اپنے مالک و آقا اور خالق کے سامنے محاسبہ کے لئے کھڑا ہونا ہو گا، از روئے الفاظ قرآنی: يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اور يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا وَّالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ○ یعنی جس روز لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہونگے اور جس روز کوئی کسی کا بھلا نہ کر سکے گا، کوئی کسی کے کام نہ آ سکے گا اور جس دن تکوینی حاکمیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ تشریعی حکومت بھی اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔ جس روز انسان کی اس دنیا کی کمائی اور سعی و جہد کا نتیجہ اس کے سامنے ہو گا۔ برے اعمال اور طغیانی و سرکشی کی پاداش میں اسے جہنم میں جھونک دیا جائے گا، اور جس نے اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی کے خوف کے پیشِ نظر اپنے نفس

کے بے لگام گھوڑے کو قابو میں رکھا ہو گا تو جنت اس کا ٹھکانا ہو گی۔ بلفظہٖ الفاظ قرآنی:

یَوْمَ یَتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ مَاسَعٰی ○ وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰی ○ فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ○ وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ○ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی ○ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی ○ فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی ○ (النازعات: ۳۵-۴۱)

"جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی، تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی تو دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہو گی۔ اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا تھا تو جنت اس کا ٹھکانا ہو گی!"

تبلیغ کا بارِ گراں

دعوت و تبلیغ کا کٹھن کام، شرک کے اندھیروں کو دور کر کے نورِ توحید پھیلانے کی یہ بھاری ذمہ داری، بدمستوں اور مدہوشوں کی اصلاح کا یہ مشکل کام، طاغوت سے پنجہ آزمائی اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حق کی سربلندی اور اقامتِ دین کے جان جوکھوں کے یہ مراحل طے کرنا، یہ تھا وہ بارِ گراں جو نبوت و رسالت سے سرفراز ہونے کے نتیجہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کے کندھوں پر آیا تھا۔ اس بارِ گراں کی خبر حضور ﷺ کو نبوت کے آغاز ہی میں دے دی گئی تھی۔ چنانچہ سورۃ المزمل میں فرما دیا گیا تھا: اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ○ یعنی "ہم عنقریب آپ پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے، ایک بھاری بوجھ ڈالیں گے"۔ اور یہ بھاری فرمان اور بھاری بوجھ چند ہی دنوں بعد حضور ﷺ کے شانوں پر رکھ دیا گیا، چنانچہ سورۃ المدثر میں حکم آگیا: یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ○ یعنی "اے کپڑا اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جاؤ اور خبردار کرو (نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑو، ان کو ہوشیار کرو، ان کو باطل عقائد اور غلط اعمال کے انجامِ بد سے ڈراؤ) اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو۔"

سورۃ المدثر کی تیسری آیت میں نبی اکرم ﷺ کو "تکبیرِ رب" کا حکم دیا گیا ہے، جس کے معنی صرف اللہ اکبر کہہ دینا اور اللہ کی بڑائی بیان کر دینا ہی نہیں بلکہ فی الواقع وہ نظام قائم

اور برپا کردینا ہے جس میں تشریعی حیثیت سے بھی اللہ تعالیٰ ہی کو حاکمِ اعلیٰ اور مقتدرِ مطلق (ABSOLUTE SOVEREIGN) تسلیم کیا جائے، اسی کا حکم حرفِ آخر ہو، اسی کی مرضی تمام مرضیوں پر حاوی ہو جائے اور سیدنا حضرت مسیح علیہ السلام کے بقول جس طرح اس کی مرضی آسمانوں میں پوری ہوتی ہے اسی طرح زمین پر بھی پوری ہو، اسی کا جھنڈا تمام جھنڈوں سے بلند تر ہو جائے اور اسی کی بات سب باتوں پر غالب ہو جائے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ "اور بات تو اللہ ہی کی غالب و بلند ہے"۔ کبریائی تو واقعتاً وہ کبریائی ہے جو عملاً قائم ہو، محض کتابوں میں لکھی ہوئی کبریائی تو کوئی کبریائی نہیں۔ اور محض زبان سے کہہ دینے سے تو کسی کی بڑائی اور کبریائی قائم نہیں ہوتی، بلکہ بڑائی اور کبریائی تو دراصل وہی ہے جس کو بالفعل بڑائی اور کبریائی تسلیم کیا گیا ہو۔ چنانچہ "تکبیرِ رب" کا حقیقی مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کے احکام، اس کی ہدایات اور اس کے اوامر و نواہی کی تعمیل کی جا رہی ہو، اس کا عطا کردہ آئین اور اس کے نازل کردہ قوانین عملاً نافذ ہوں، اور اس طرح اسے حقیقی طور پر مقتدر تسلیم کیا گیا ہو۔

مدنی دور میں اس بات کو مزید واضح کر دیا گیا کہ نبی اکرم ﷺ چونکہ خاتم الانبیاء و المرسلین ہیں، لہٰذا دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ اظہارِ دینِ حق اور غلبۂ دینِ متین بھی نہ صرف آپؐ کے فرائضِ رسالت میں شامل ہے بلکہ آپ ﷺ کی بعثت کی غایتِ اولیٰ ہے۔ چونکہ تاقیامِ قیامت کوئی اور رسول یا نبی آنے والا نہیں لہٰذا بنی نوع انسان پر اتمامِ حجت کے لئے اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنی آخری کتاب اور مکمل ہدایت نامے قرآن مجید کی حفاظت کا خود ذمہ لیا وہاں یہ بھی ضروری قرار دیا کہ دینِ حق بہ تمام و کمال قائم بھی ہو تاکہ انسان کے لئے کوئی عذر پیش کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔ یہ مضمون مدنی دور کی تین سورتوں، سورۃ التوبہ (آیت ۳۳)، سورۃ الفتح (آیت ۲۸) اور سورۃ الصف (آیت ۹) میں وضاحت کے ساتھ کھول دیا گیا:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق (اسلام) دے کر تاکہ وہ اس (ہدایت اور دین حق) کو پورے کے پورے دین (نظام حیات) پر غالب کر دے"۔

تو یہ تھا وہ بھاری بوجھ جو نبی اکرم ﷺ کے کاندھوں پر رکھا گیا تھا اور ظہورِ نبوت کے وقت صورت حال یہ تھی کہ آپ اس وقت پورے عالم انسانی میں اس دعوت کے علمبردار کی حیثیت سے بالکل یکہ و تنہا تھے۔ دنیا کے بتکدہ میں توحید کا غلغلہ بلند کرنا، تکبیرِ رب کا نعرہ لگانا، خدا کی کبریائی کو عملاً نافذ کرنے کی جدوجہد کرنا، اظہار و غلبۂ دین کے لئے کشمکش کرنا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا داعی بن کر کھڑا ہونا، اعمالِ صالحہ اور مکارمِ اخلاق کی دعوت کا علم بلند کرنا، اور ظلم و تعدی، جور و ستم اور استبداد و استحصال کے خلاف سینہ سپر ہونا کوئی آسان کام تو نہیں تھا، اسی لئے اسے "قولِ ثقیل" سے تعبیر کیا گیا۔ تکبیرِ رب کی خاطر کھڑے ہونے کا مطلب پورے معاشرہ سے اعلانِ جنگ تھا اور حضور ﷺ کو حکم تھا کہ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ○ یعنی "کھڑے ہو جاؤ، پس (بنی نوع انسان کو) خبردار کرو! اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو!"--- آپؐ سے فرمایا گیا کہ آپ اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی فرماتے رہیں اور "وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ" اور "وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ ○" کے مصداق چاہے مشرکوں اور کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے۔ وہ لوگ جن کے مفادات پر ضرب پڑ رہی ہو وہ کتنا ہی راستہ روکیں اور مزاحمت کریں، وہ لوگ جن کی جھوٹی مذہبی قیادتیں خطرہ میں پڑ گئی ہوں اور وہ چاہے کتنی مخالفتیں کریں، کتنی ہی صعوبتیں پہنچائیں، ظلم و تشدد کا کتنا ہی بھیانک مظاہرہ کریں اور جور و تعدی کے کتنے ہی پہاڑ توڑیں، ان تمام مخالفتوں، مظالم اور استبداد کے علی الرغم، ان تمام موانع کے باوجود اور ان تمام شدائد و مصائب کے باوصف نبی اکرم، سرورِ عالم، محبوبِ خدا، رحمۃ للعالمین، خاتم الانبیاء والمرسلین محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا کہ تکبیرِ رب کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے طاغوتی طاقتوں سے پنجہ آزمائی کریں، باطل قوتوں سے نبرد آزما ہوں اور اس راستے میں ہر نوع کے شدائد و مصائب اور ہر طرح کے طنز و استہزاء اور طعن و تشنیع کے وار برداشت کریں۔ یہ وہ بھاری بوجھ اور بھاری ذمہ داری تھی جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے کاندھوں پر ڈالی گئی تھی۔

نبی اکرم ﷺ کے فرضِ منصبی کے ادراک سے نصرتِ رسول ﷺ کا مفہوم خود بخود واضح ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جو شخص حضور ﷺ پر ایمان لائے اور اس کا دل اس بات کی تصدیق کرے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اس کے لئے لازم ہے کہ اب فریضۂ رسالت و نبوت کی ادائیگی میں حضور ﷺ کا رفیق و ناصر بنے۔ اب اسے

تکبیر رب کی کٹھن مہم میں، اقامتِ دین اور غلبۂ دین کی جاں گسل جدوجہد میں، دعوت و تبلیغ کے راہِ خار زار میں، حق و باطل کے معرکۂ کار زار میں اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے میدانِ جنگ و جدال میں حضور ﷺ کا دست و بازو اور آپ کا حامی و مددگار بننا ہوگا۔ جہاں حضور ﷺ کا پسینہ گرے وہاں وہ اپنا خون بہانے کو اپنے لئے باعثِ فخر و سعادت سمجھے، اسے حضور ﷺ کے مشن کی تکمیل کے لئے سر دھڑ کی بازی لگانے اور اس بازی میں نقدِ جان کی نذر گزارنے میں فوز و فلاح اور کامیابی و کامرانی کا یقین ہو، اس کا جینا اور مرنا حضور ﷺ کی دعوت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے ہو، اس کا مال و منال اور اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اس دینِ حق کے غلبے کے لئے وقف ہوں جو خالقِ کائنات اور رب العالمین کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کو دے کر مبعوث فرمایا گیا۔ اگر حضور ﷺ پر ایمان لانے والوں کا نصب العین اور مقصدِ حیات "اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○" نہ ہو تو ان کا ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کا دعویٰ غیر معتبر ہے، اور مغالطے اور فریبِ نفس پر مبنی ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد نصرتِ رسول ﷺ ہے۔

لفظ نصرت سے کسی کو یہ خیال آسکتا ہے کہ اللہ کے نبیؑ اور رسولؐ کو کسی انسان کی مدد کی کیا حاجت؟ نبی کا مقام و مرتبہ تو یہ ہے کہ اللہ خود ان کا مولا اور ناصر ہے، پھر اللہ کے فرشتے نبیؐ کے پشت پناہ ہیں، اور نبیؐ کو تو روح القدس کی تائید حاصل ہوتی ہے، لہٰذا نبیؐ کو اہلِ ایمان کی مدد و حمایت کی کیا ضرورت؟ پس اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس عالم اسباب میں دین حق کے غلبہ کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہے، جن کو زمین میں اللہ کے خلیفہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے انبیاء و رسل کو دین حق کے ساتھ مبعوث فرماتا ہے۔ قبولِ حق کی استعداد فطرتِ انسانی میں پہلے سے ودیعت شدہ ہوتی ہے۔ پھر آفاق و انفس میں اللہ کی آیات انبیاء و رسل کی دعوت کے قبول کرنے میں مددگار ہوتی ہیں۔ ان کی صداقت کے ثبوت کے لئے ان پر آسمانی کتابوں کا نزول بھی ہوتا ہے جو واضح اور روشن آیات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو حسّی معجزات سے بھی سرفراز فرماتا ہے، لیکن حق کو قبول یا رد کرنے کے فیصلہ کے لئے وہ انسان کو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: "اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ○" یعنی "ہم نے تو انسان کو سیدھی راہ سُجھادی ہے، اب وہ حق کو تسلیم کرے یا ناشکری کرے!" ---- بہرحال اقامتِ دین، شہادتِ حق

اور دعوت و تبلیغ کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہوتی ہے۔ نبی اس دعوت و تبلیغ کا داعی اول ہوتا ہے اور وہی سب سے پہلے دنیا کے سامنے شاہد بن کر کھڑا ہوتا ہے' جیسا کہ سورۃ الاحزاب (آیات ۴۵'۴۶) میں فرمایا گیا:

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۝ وَّدَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝

"اے نبی (ﷺ)! ہم نے آپ کو گواہی دینے والا' بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا' اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے"۔

پھر جو لوگ نبی کی دعوت قبول کریں اور اس پر ایمان لائیں' اللہ تعالیٰ عزوجل اس عالمِ اسباب میں ان کو جانچتا ہے' ان کا امتحان لیتا ہے۔ چنانچہ اس عالمِ علت و معلول اور عالمِ اسباب میں اگر دین پھیلے گا تو اللہ پر' رسولؐ پر اور آخرت پر یقین رکھنے والے مومنینِ صادقین کی جانفشانیوں اور سر فروشیوں' ان کے ایثار و قربانی اور ان کی جدوجہد سے پھیلے گا۔ دنیا میں تشریعی طور پر اللہ کی کبریائی اگر فی الواقع قائم ہوگی تو ان ہی کی کشاکش' محنت اور جہاد و قتال سے قائم ہوگی۔ وہ خاک و خون میں لوٹیں گے اور راہِ حق میں نقدِ جان کا نذرانہ گزاریں گے تو اللہ کی تائید و نصرت سے اللہ کا دین غالب ہوگا۔ یہی سنت اللہ ہے' اور اللہ کو ایسے ہی جوانمردوں سے محبت ہے۔ بفحوائے الفاظ قرآنی:

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ (الصف: ۴)

"یقیناً اللہ ان کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صفیں باندھ کر جنگ کرتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔"

اور انہی سرفروشوں کے بارے میں شاعر نے کہا ہے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اسی جدوجہد اور کشمکش میں مومنین صادقین کی آزمائش ہے۔ اسی سے معلوم ہوگا کہ کون واقعتاً ایمان رکھتا ہے اور کون ایمان کا جھوٹا دعویدار ہے۔ اس جہاد و قتال کے ذریعے

حضور ﷺ کے مشن کی تکمیل میں سر دھڑ کی بازی لگانے کے عمل کو اللہ تعالیٰ نصرتِ رسول ﷺ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ نصرتِ رسول ﷺ ہی وہ کسوٹی ہے جس پر عالم رنگ و بو میں سچے اور کھوٹے پرکھے جاتے ہیں' جیسا کہ سورۃ العنکبوت (آیت ۱۱) میں فرمایا: وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ○ "اور اللہ تعالیٰ ظاہر کردے گا ان کو بھی جو (واقعتاً) ایمان لائے ہیں اور ان کو بھی جو منافق ہیں"۔ یعنی اللہ تعالیٰ کھول کر رکھ دے گا کہ کون حقیقتاً ایمان رکھتے ہیں اور کون جھوٹ موٹ کے مومن بنے پھرتے ہیں جو حقیقتِ واقعی کے لحاظ سے منافق ہیں۔ اس دنیا میں ایمان و نفاق کا فیصلہ انہی آزمائشوں' ان ہی سرفروشیوں اور ان ہی جانفشانیوں سے ہوتا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے کو اٹھایا یا نہیں اٹھایا؟ رسول ﷺ کے مشن کو اپنی زندگی کا مشن بنایا یا نہیں بنایا؟ محمد رسول اللہ ﷺ کے منصب رسالت کی تکمیل میں اپنا جان و مال کھپایا یا نہیں کھپایا؟ دعوت الی اللہ کے مراحل میں صبر و استقامت دکھائی یا نہیں دکھائی؟ اگر یہ نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں' پھر تو رسول اللہ ﷺ پر ایمان کا دعویٰ ناقابلِ قبول ٹھہرے گا' رسول ﷺ سے محبت کا دعویٰ بھی مسترد کر دیا جائے گا اور رسول ﷺ کی اطاعت کا دعویٰ بھی غیر معتبر اور محض ریا اور دکھاوا قرار پائے گا۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ذرا چشمِ تصور میں غزوۂ احد کا نقشہ لائیے کہ محبوب خدا' سرورِ عالم' محمد رسول اللہ ﷺ اپنے جان نثار صحابہؓ کی معیت میں مشرکین کے سامنے سینہ سپر ہیں' آپؐ اور آپ کے صحابہؓ اس معرکۂ کارزار میں جان کی بازی لگا رہے ہیں' اس کشمکش میں رحمۃ للعالمین زخمی ہو گئے ہیں' خود کی کڑیاں سر مبارک میں گھس گئی ہیں' رخسارِ مبارک بھی مجروح ہو گیا ہے' دندانِ مبارک بھی شہید ہو چکے ہیں' آپ کا مقدس خون راہ حق میں بہہ رہا ہے ------ اور فرض کیجئے کہ عین اس وقت کوئی مدعیٔ عشقِ رسول ﷺ کہیں اپنے گھر میں بیٹھا درود کی تسبیح پڑھ رہا ہو' حضور ﷺ پر سلام پڑھ رہا ہو یا حضور ﷺ کی شان میں نعتیں پڑھے جا رہا ہو' تو یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہو گی۔ اس طرزِ عمل کا ایمان بالرسول اور محبتِ رسول ﷺ کے ساتھ کیا نسبت و تعلق؟ تو یہ طرزِ عمل کہ محمد رسول اللہ ﷺ تو کارزارِ احد میں' جہاں پر ہر چہار طرف موت کا رقص ہو رہا ہو' اپنے جاں نثاروں کے ساتھ اپنے خون سے ایک نئی تاریخ رقم فرما رہے ہوں اور اللہ کے جھنڈے کو سربلند کرنے کے لئے

سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہوں اور کوئی عاشقِ رسولؐ کہیں کسی گوشہ میں بیٹھا درود و سلام پڑھ رہا ہو، جس قدر مضحکہ خیز اُس وقت ہوتا اسی قدر مضحکہ خیز آج بھی ہے۔ اس لئے کہ حضور ﷺ کا مشن مردہ نہیں ہوا، زندہ و تابندہ ہے اور تا قیامت زندہ رہے گا۔ حضور ﷺ کی رسالت تا قیام قیامت ہے اور حضور ﷺ کے بعد یہ فریضۂ رسالت امتِ مسلمہ کو بحیثیتِ امت ادا کرنا ہے۔ بنی نوع انسان آج بھی ہدایتِ ربانی کی محتاج ہے۔ دنیا آج بھی طاغوتی شکنجے میں گرفتار ہے۔ آج بھی ہر اس شخص پر جو خود کو مسلمان سمجھتا ہے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان تک حق کا پیغام پہنچائے۔ حضور ﷺ کی بعثت صرف اہلِ عرب کے لئے نہ تھی بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے تھی۔ حضور ﷺ کی بعثت ایک مخصوص زمانہ اور وقت کے لئے نہ تھی بلکہ قیامِ قیامت تک کے لئے تھی۔ توحید کی دعوت دینا، شرک کا ابطال کرنا اور اللہ کے دین کو عملاً غالب اور قائم کرنا محمد رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت تھا۔ جیسا کہ فرمایا:
هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ------
حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اِس آیت کی کامل شان کا ظہور ابھی باقی ہے۔ اس کا ظہور اُس وقت تک نہ ہو گا جب تک اس پورے کرۂ ارضی پر اسی طرح اللہ کے دین کا جھنڈا نہیں لہرا تا اور ادیانِ باطلہ کے جھنڈے سرنگوں نہیں ہو جاتے جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ نے تیئس سال کی محنتِ شاقہ کے نتیجہ میں جزیرہ نمائے عرب میں لہرایا تھا اور وہاں پہلے سے قائم طاغوتی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ چنانچہ جب تک یہ کام انجام تک نہ پہنچے، نبی اکرم ﷺ کا مقصد رسالت و بعثت ابھی شرمندۂ تکمیل ہے اور اس کی تکمیل کی ذمہ داری امتِ مسلمہ پر ہے۔ بقول علامہ اقبال ۔

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے

پس اب اُس مدعیٔ ایمان، اُس عاشق رسولؐ اور اس محبِّ رسولؐ کو خوب اچھی طرح اپنے دل میں جھانک کر اپنا جائزہ لینا چاہئے جسے حضور ﷺ کے مقصدِ بعثت اور آپؐ کے مشن سے سرے سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور اسے خود فیصلہ کرنا چاہئے کہ اس کے ان دعاوی میں کتنی صداقت ہے۔ آج عملاً یہ صورت حال رونما ہو چکی ہے کہ بقولِ حالی ۔

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

یہی وہ صورت حال ہے جس کی حضور ﷺ نے خبردی تھی۔ صحیح مسلمؒ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بَدَأَ الاسلامُ غریبًا وَسَیعودُ کَما بَدَأَ فَطُوبٰی لِلغُرَباء

"اسلام کی ابتدا غربت کی حالت میں ہوئی تھی اور یہ اسی حالت میں پھر لوٹ جائے گا۔ تو بشارت ہے "غرباء" کے لئے"

اردو میں غریب کے معنی مفلس و نادار کے ہوتے ہیں، لیکن عربی میں یہ لفظ "اجنبی" کے معنی میں آتا ہے۔ چنانچہ حدیث کا مفہوم یہ ہو گا کہ اسلام کا آغاز اجنبیت سے ہوا۔ جیسے ایک اجنبی مسافر اپنے اہل و عیال اور اپنے وطن سے دُور رہ کر تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہے، اسی طرح اسلام بھی ابتداء میں اجنبی اور تنہا تھا یعنی مسلمان بہت کم تھے۔ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ وہ پھر غریب یعنی اجنبی ہو جائے گا۔ کفار، ملحدین اور مبتدعین کی کثرت ہوگی، اگرچہ نام کے مسلمان کثیر التعداد ہوں گے لیکن سچے، موحد، دیندار اور متقی افراد کم سے کم ہوتے چلے جائیں گے۔ تو ان قلیل "غرباء" کے لئے (بہشت کی) بشارت اور مبارک باد ہے۔ مسند احمدؒ کی ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

الغُرَباءُ الّذین یُحیُون سُنّتی و یُعَلِّمُونها النّاسَ

"غرباء وہ ہیں جو میری سنت کو زندہ کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے"۔

(واضح رہے کہ حضور ﷺ کی سب سے بڑی اور سب سے اہم سنت دعوت و تبلیغ کی سنت ہے جس پر ان شاء اللہ آئندہ صفحات میں روشنی ڈالی جائے گی۔)

ایک اور روایت میں حضور ﷺ نے خبردی کہ:

لَا یبقٰی مِنَ الاِسلامِ الا اسْمُہٗ وَلَا یبقٰی مِن القُرآن اِلّا رَسْمُہٗ

"اسلام میں سے اس کے نام کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے اس کے حروف کے سوا کچھ نہ بچے گا"۔

اس حدیث کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ روئے زمین پر اسلام کہیں فی الواقع قائم نظر نہیں آئے گا۔

انسانوں کے کردار اور ان کی شخصیتوں میں اسلام کو فی الواقع کار فرما دیکھنے کے لئے نگاہیں ترسیں گی۔ قرآن محض ایک مقدس کتاب کی حیثیت سے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا اور اس نورِ ہدایت سے رہنمائی کی طلب مفقود ہو جائے گی۔ اس کی تلاوت صرف رسماً اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ حصولِ ثواب یا ایصالِ ثواب کے لئے باقی رہ جائے گی۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صورت حال عملاً پیدا ہو چکی ہے جس کی خبر ان احادیثِ مبارکہ میں دی گئی ہے۔ اس صورتحال میں ہم میں سے ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ اگر اسے حضور ﷺ سے محبت ہے، اگر اسے حضور ﷺ سے کوئی مخلصانہ تعلق ہے، اگر وہ سمجھتا ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ اس کا رشتہ صحیح بنیادوں پر قائم ہے تو کیا اس کا مقصودِ حیات اور نصب العین بھی وہی ہے یا نہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت تھا؟ یعنی اعلاء کلمۃ اللہ، اظہارِ دین الحق علی الدّین کلّہٖ اور تکبیرِ رب ------ اگر ہم میں سے کسی کے مقاصد زندگی میں اللہ کے دین کو دنیا میں غالب کرنے کی سعی و جہد کرنے اور نورِ توحید سے پورے کرۂ ارضی کو منور کرنے کا عزم شامل نہیں اور اگر وہ حضور ﷺ کے مشن کی تکمیل میں حضور ﷺ کا دست و بازو اور آپؐ کا ساتھی نہیں بن رہا تو اس کا حضور ﷺ سے تعلق درست نہیں، جس کی اسے فکر کرنی چاہئے۔ تو یہ ہے حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی تیسری بنیاد جو "وَنَصُرُوْہُ" کی تشریح میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

اتباع کا تقاضا

"نصرتِ رسولؐ" کی مزید وضاحت "اتباعِ رسولؐ" کے حوالہ سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، اتباع کے معنی ہیں حضور ﷺ کے نقش قدم پر چلنا اور حضور ﷺ کے ہر عمل کی پیروی کرنا۔ اب ہمیں غور کرنا چاہئے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں جو عمل تواتر کے ساتھ ہوا ہے، پیہم و مسلسل ہوا ہے، جو پورے تیئس برس تک شب و روز ہوا ہے، جس میں ایک لمحہ اور ایک گھڑی کا وقفہ نہیں، وہ عمل کیا ہے؟ نماز کے بارے میں پوچھا جا سکتا ہے کہ کب فرض ہوئی؟ رکعتوں کا تعین کب ہوا؟ کب دو تھیں، کب چار ہوئیں؟ روزوں کی فرضیت کب ہوئی؟ زکوٰۃ کا نظام کب قائم ہوا اور مقدارِ نصاب کب متعین ہوا؟ شراب و قمار کب حرام ہوئے؟ سود کی حرمت کا حکم کب نازل ہوا؟ ان سب کے لئے احادیث اور سیرت سے اوقات اور زمانے کا تعین کیا جا سکتا ہے، جس میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن

ایک بات متفق علیہ ہے جس میں کسی اختلاف اور قیل و قال کی گنجائش نہیں۔ اور وہ بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اول یومِ بعثت سے لے کر اس حیاتِ دنیوی کے آخری سانس تک جو عمل پیہم، مسلسل اور متواتر شب و روز کیا ہے، جلوت و خلوت میں کیا ہے، وہ عمل دعوت و تبلیغ کا عمل ہے، وہ تکبیرِ رب کی سعی و جہد ہے، وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جہاد ہے۔ وہ دینِ حق کے سربلند کرنے کی تگ و دو ہے، وہ غلبہ و اقامتِ دین کے لئے مجاہدہ اور تصادم ہے۔ اس سعی و جہد اور مجاہدہ و جہاد کی شکلیں بدلی ہیں، صورتوں میں تبدیلی آئی ہے، بتدریج مختلف مراحل آئے ہیں۔ کہیں مکی دور میں یہ جدوجہد دعوت و تبلیغ اور شدائد و مصائب کے برداشت کرنے کے درجہ میں تھی، جس میں آپ کو طائف کے گلی کوچوں میں پتھر بھی کھانے پڑے۔ کہیں وہ مدنی دور میں باطل کے ساتھ مسلح تصادم کے نتیجے میں بدر و احد اور احزاب و تبوک کے معرکوں کی صورت میں ہویدا تھی، کہیں قبائلِ عرب اور قرب و جوار کے سلاطین کو وفود و خطوط کے ذریعہ دعوت دینے کے مراحل میں تھی، کہیں صلح حدیبیہ، فتح مکہ اور غزوۂ حنین کی صورت میں جاری و ساری تھی۔ لیکن آپ کا جو عمل تیئس سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے، ہر لحہ ہر گھڑی اور ہر آن انجام دیا جا رہا ہے، وہ ہے عملِ دعوت و تبلیغ۔ اب جو شخص بھی متبعِ رسول ﷺ ہونے کا مدعی ہو، جو یہ سمجھتا ہو کہ سنتِ رسول ﷺ کا التزام ضروری ہے، اس کے بارے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ اس کی زندگی میں آنحضور ﷺ کی سب سے بڑی، سب سے زیادہ متواتر، متفق علیہ اور ثابت شدہ سنت کس حال میں ہے؟ اس کے اندر دعوت و تبلیغ کی کتنی تڑپ اور کتنی لگن ہے؟ اور وہ اس کام میں کتنا وقت خرچ کر رہا ہے اور کتنا مال لگا رہا ہے؟

رسولؐ کی نصرت، اللہ کی نصرت ہے

نصرتِ رسولؐ کے حوالے سے قرآن مجید کا ایک اہم مقام سورۃ الصف کی آخری آیت ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کا ایک قول نقل ہوا ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے حواریوں سے دریافت فرمایا: "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ" یعنی "اللہ کی راہ میں میرا مددگار کون ہے؟" تکبیرِ رب، دعوتِ توحید، تبلیغِ دین اور نورِ ہدایت سے دنیا کو منور کرنے کا جو کام میرے سپرد ہوا ہے اس کی جدوجہد میں اب کون ہے جو میرا مددگار بنے؟ کون ہے جو اس راہ میں میرا دست و بازو بنے؟ آنحضرتؐ کے حواریوں کے جواب کو قرآن مجید یوں نقل فرماتا ہے: "قَالَ

اَلْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ "یعنی "حواریوں نے کہا ہم ہیں اللہ کے مددگار"۔ حضرت مسیحؑ کے سوال اور حواریوں کے جواب کے الفاظ توجہ طلب ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے دریافت کیا تھا: "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ" جواب دیا گیا: "نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ" جواب میں نصرت کی نسبت بدل گئی۔ اس نسبت کی تبدیلی میں حکمت یہ ہے کہ رسولؑ کی نصرت اللہ ہی کی نصرت ہے اور فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں جو شخص رسولؑ کا حامی، مددگار اور دست و بازو بنتا ہے، اس راہ میں جانفشانی اور سرفروشی کا مظاہرہ کرتا ہے اور اپنا جان و مال کھپاتا ہے، وہ اللہ کے رسولؑ کی نصرت بھی کر رہا ہے اور اللہ کی نصرت میں بھی لگا ہوا ہے۔ چنانچہ غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کو اللہ تعالیٰ اپنی اور اپنے رسولؑ دونوں کی نصرت سے تعبیر فرماتا ہے۔

۴۔ اتباعِ قرآن مجید

اب اس کے بعد نبی اکرم ﷺ سے ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد کا ذکر ہے اور وہ ہے نور قرآن مجید کو حرزِ جان بنانا، اسے اپنا رہنما قرار دینا اور اس کا اتباع کرنا۔ فرمایا: وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَہٗ "اور اتباع کیا اُس نور کا جو ان (ﷺ) کے ساتھ (یا ان پر) نازل کیا گیا"۔ یہاں نور سے مراد قرآن ہے، یہ وہ نورِ ہدایت ہے جو حضور اکرم ﷺ پر نازل ہوا، اس کا اتباع لازم ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جو تین اصطلاحات پہلے بیان ہو چکیں یعنی "اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ" تو وہ انتہائی جامع تھیں۔ اب اس چوتھی بات کا اضافہ کس مقصد کے لئے کیا جا رہا ہے کہ "وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَہٗ"؟ یہ اس لئے ضروری تھا کہ نبی اکرم ﷺ بہرحال اس دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے۔ ایک معیّن مدت تک کے لئے ہی صحابہ کرامؓ کو حضور ﷺ کے وجودِ قدسی کی معیت اور صحبت حاصل رہنی تھی۔ آنحضور ﷺ کے اِس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ابد الآباد تک کے لئے جس چیز کو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا جانشین اور قائم مقام بننا تھا وہ یہی قرآن مجید ہے، جو فرقانِ حمید بھی ہے اور کتابِ مبین بھی۔ یہ اللہ کا وہ کلام ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا گیا، گویا آپ ﷺ کے ساتھ اترا۔ اور یہ وہ نور ہے جو دائم و قائم ہے۔ بقول اقبال ؎

مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست اُو
زندہ و پائندہ و گویاست اُو

چنانچہ حجتہ الوداع کے خطبہ میں حضور ﷺ نے جو آخری بات فرمائی وہ اسی قرآن مجید کے بارے میں تھی۔ مسلم شریف کی روایت میں خطبہ حجتہ الوداع کے اختتامی اور آخری الفاظ یہ ہیں: "وَقَد ترکتُ فیکم مَا اِنِ اعتَصَمتُم بہٖ فلن تَضِلُّوا ابدًا و ھو کتابُ اللّٰہ" کہ میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جارہا ہوں' جس کا سررشتہ اگر تم مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو تم تاابد (کبھی) گمراہ نہیں ہو گے' وہ چیز ہے کتاب اللہ۔

نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد گرامی کے بارے میں گفتگو سے قبل مناسب ہو گا کہ ہم اس ارشاد گرامی کا موقع اور محل اچھی طرح سمجھ لیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حجتہ الوداع کے موقع پر حضور اکرم ﷺ نے یہ محسوس فرمالیا تھا کہ آپؐ کشمکش حیات کی آخری منزلیں طے فرما رہے ہیں۔ اس احساس کا اظہار پورے خطبہ میں موجود ہے' بلکہ خطبہ کا آغاز ہی آپ نے ان الفاظ سے فرمایا: ایّھاالنّاس اسمعوا قولی' فانّی لاادری لعلی لاالقاکم بعد عامی ھذا بھذا الموقف ابدًا "لوگو! میری بات غور سے سنو' کیونکہ شاید اس سال کے بعد اس مقام پر میں تم سے دوبارہ نہ مل سکوں"۔ چنانچہ اس خطبہ میں حضور ﷺ کے ارشادات کا انداز وصیت کا سا ہے یعنی امت کو ان امور کی تاکید و تلقین جن کی دین و شریعت میں اساسی حیثیت ہے۔ خطبے کے آخری حصے میں آپ ﷺ نے یہ بات تاکیداً ارشاد فرمائی کہ میرے بعد قرآن کو تھامنا' اسے حرزِ جان بنانا' اس کے دامن سے وابستہ رہنا اور ہرگز یہ خیال نہ کرنا کہ میں تم کو بے یارو مددگار چھوڑ کر جارہا ہوں۔ تمہاری ہدایت اور رہنمائی کے لئے میں اپنے پیچھے اللہ کی کتاب چھوڑے جارہا ہوں' اللہ کا نازل کردہ وہ نور چھوڑے جارہا ہوں جو تمہیں کفرو شرک کے اندھیروں سے نکال کر توحید کے صراط مستقیم کی طرف لے جائے گا۔ اگر تم اس قرآن کو مضبوطی سے تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔

حبل اللہ

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے فرمودات کی رُو سے قرآن مجید ہی وہ "حبل اللہ" ہے جس کے ساتھ چمٹ جانے اور وابستہ ہو جانے کا سورۂ آل عمران میں حکم آیا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا حکم سورۃ الحج میں وارد ہوا ہے جس کی آخری آیت میں فرمایا گیا: "وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰہِ" "اللہ کے ساتھ چمٹ جاؤ' اس کے دامن سے وابستہ ہو جاؤ"۔ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ سے کیسے چمٹیں' اس کے دامن سے کیسے وابستہ ہوں؟ سورۂ آل عمران

میں اس کو مزید کھولا گیا: "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ" کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو۔ اللہ کی رسی کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ اس وضاحت کے باوجود یہ سوال باقی رہا کہ پھر حبل اللہ سے کیا مراد ہے، کسے تھامیں؟ کس سے جڑیں؟ اس کی شرح و توضیح نبی اکرم ﷺ نے فرمادی اور وحی غیر متلو کے ذریعہ امت کو مطلع فرمایا دیا کہ اللہ کی یہ کتاب قرآن مجید ہی درحقیقت اللہ کی وہ مضبوط رسی ہے جس سے اعتصام کا، جس کے ساتھ چمٹ جانے اور جڑ جانے کا اور جس کو تھام لینے کا حکم سورۂ آل عمران میں دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک نہایت جامع حدیث میں جس کے راوی حضرت علیؓ ہیں اور جس میں قرآن مجید کی عظمت و شوکت، اس کے مرتبہ و مقام اور اس کی اہمیت کا بیان مفصل انداز میں ہوا ہے، نبی اکرم ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: "ھو حبلُ اللّٰہِ المتینُ" یعنی "یہی قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے"۔ اسی طویل حدیث میں قرآن حکیم کی شان میں حضور ﷺ کے یہ الفاظ بھی نہایت لائق توجہ ہیں کہ "قرآن مجید وہ کتاب ہے جس سے علماء کبھی سیری محسوس نہیں کریں گے، نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کتاب پر کبھی باسی پن طاری ہوگا اور نہ ہی اس کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے"۔ یعنی اس کے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم نہ ہوگا اور اس کان سے حکمت و معارف کے نئے نئے موتی اور جواہرات برآمد ہوتے رہیں گے۔ (یہ حدیث صحیح ترمذی اور سنن دارمی میں روایت ہوئی ہے۔)

نبی اکرم ﷺ نے تو خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ قرآن کو مضبوطی سے تھامو گے تو تا ابد گمراہ نہیں ہوگے، لیکن بدقسمتی سے اسی حبل اللہ سے ہم اپنا تعلق توڑتے چلے گئے۔ جب حبل اللہ کو مضبوطی سے تھامنے اور اس کے ساتھ پورے طور پر وابستہ ہو جانے کا نتیجہ گمراہی سے حفاظت قرار پایا تو ظاہر بات ہے کہ اس کو چھوڑنے کا نتیجہ گمراہی کی صورت ہی میں ظاہر ہونا چاہئے۔ اپنی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں، آپ کو واضح طور پر نظر آئے گا کہ جب تک مسلمانوں نے قرآن کو مضبوطی سے تھامے رکھا، اسی کو حقیقی معنوں میں اپنا ہادی و رہنما سمجھا، اپنے عمل، اخلاق اور معاملات کو اسی کے مطابق استوار رکھا تو انفرادی اور اجتماعی، ہر سطح پر ان کا رعب اور دبدبہ قائم رہا، دنیا میں وہ سربلند اور غالب رہے اور اسلام کا جھنڈا چہار دانگِ عالم میں لہراتا رہا، لیکن جیسے جیسے وہ کتاب اللہ سے بے پروا ہوتے اور نور و حکمت کے اس خزینہ سے بے تعلق ہوتے چلے گئے ویسے ویسے ان پر زوال کے سائے گہرے ہوتے گئے اور وہ بتدریج

فساد اور انحطاط میں مبتلا ہوتے چلے گئے' اور نتیجۃً مغلوب و مقہور ہوگئے۔ ان کے عقائد خراب ہوئے' اعمال بگڑے اور ان میں بدعات اور ہوائے نفس کو در اندازی کا موقع ملا۔ ان کا اتحاد پارہ پارہ ہوا اور بجائے اس کے کہ وہ بنیانِ مرصوص بنتے' بے شمار فرقوں اور قومی و نسلی اور لسانی و جغرافیائی گروہوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے۔ قرآن سے ہمارا جو حقیقی تعلق ہونا چاہئے آج اسے ہم ترک کر چکے ہیں۔ ہمارا اس سے تعلق اس کے سوا اور کچھ نہیں رہا کہ ہم اسے محض حصولِ برکت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ہم میں سے گنتی کے چند لوگ اگر اس کی تلاوت کرتے بھی ہیں تو اسے سمجھنے اور اس سے ہدایت اخذ کرنے کے لئے نہیں' بلکہ محض حصولِ ثواب کے لئے! بلکہ میں تو کہا کرتا ہوں کہ اب تو حصولِ ثواب کا معاملہ بھی ختم ہوا' اب تو صرف ایصالِ ثواب کی مجالس کے لئے قرآن خوانی رہ گئی ہے۔ گویا اپنے لئے بھی اب ہم تلاوتِ قرآن کے ذریعے حصولِ ثواب کی کوئی خاص حاجت محسوس نہیں کرتے بلکہ اب تو قرآن مجید ہمارے نزدیک صرف مُردوں کو ثواب پہنچانے کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا ہے!!!--- بقول اقبال ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسین او آساں بمیری

سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کا ایک استغاثہ نقل فرمایا ہے: وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ○ "اور کہا رسولؐ نے کہ اے میرے رب' میری قوم نے اِس قرآن کو پس پشت ڈال دیا تھا' نظرانداز کر دیا تھا"۔ اگرچہ سیاق و سباق کے لحاظ سے اس آیت میں اصلاً تذکرہ ان کفار کا ہے جن کے نزدیک قرآن مجید سرے سے کوئی قابل التفات چیز تھی ہی نہیں اور جو قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام اور وحیِ ربانی تسلیم ہی نہیں کرتے تھے' تاہم قرآن کے وہ ماننے والے بھی اس کی ذیل میں آتے ہیں جو عملاً قرآن کے ساتھ عدمِ توجہ و التفات کی روش اختیار کریں یعنی جو نہ اسکی تلاوت کو اپنے معمولات میں شامل کرتے ہوں' نہ اسے اپنے غور و فکر کا موضوع بناتے ہوں اور نہ ہی اسے اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانے پر آمادہ ہوں۔ یہاں آیتِ زیرِ نظر "وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَہٗ" میں "اتباع" کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں پیروی کرنا۔ ہر حکم' ہر ہدایت' ہر امر اور ہر نہی کی تعمیل کرنا۔ ہمارا قرآن حکیم کے ساتھ اگر اس نوع کا تعلق ہوگا تو ہم نہ صرف یہ کہ گمراہی سے محفوظ رہ سکیں گے بلکہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہماری نسبت بھی

صحیح بنیادوں پر استوار رہ سکے گی!..... یہاں یہ بات اب بالکل واضح ہو گئی کہ کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامنا' اس کو اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں ہادی' حکم اور راہنما قرار دینا' اس کی تعلیمات پر عمل کرنا' اس کی صبح و شام تلاوت کرنا' اس میں تدبر اور غور فکر کرنا' اس کو حرزِ جان بنانا' اس کا اتباع کرنا' یہ ہے نبی اکرم ﷺ سے ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد۔ گویا اگر ہم اس کتاب سے جڑے تو محمد ﷺ سے جڑ گئے اور اس سے کٹے تو محمد ﷺ سے کٹ گئے۔

قرآن مجید کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے' اس ضمن میں یہ حدیث شریف نہایت جامع ہے جو حضرت عبیدہ ملیکی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جس کے مطابق آں حضور ﷺ نے فرمایا:

یَا اھلَ القراٰن لا تتوسّدُوا القراٰنَ وَاتلوہ حقَّ تلاوتہ من اٰناء الّیل والنّھارِ وَافشُوہ وتغنّوہ وتدبّروا فیہ لعلّکم تفلحون (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اے قرآن والو! قرآن کو بس اپنا تکیہ ہی نہ بنالو' بلکہ دن اور رات کے اوقات میں اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے' اور اس کو (چہار دانگِ عالم) میں پھیلاؤ' اور اس کو خوش الحانی سے حظ لیتے ہوئے پڑھا کرو' اور اس میں تدبر اور غور و فکر کیا کرو..... تاکہ تم فلاح پاؤ"۔

اس حدیثِ مبارک میں مسلمانوں کو حضور ﷺ نے اہلِ قرآن خطاب دیا ہے: (یَاَھلَ القرآن)۔ یہ خطاب ہم وزن ہے اس خطاب کے جو قرآن یہود و نصاریٰ کو دیتا ہے "یَاَھلَ الکِتاب"۔ الکتاب کا آخری' مکمل اور جامع ایڈیشن "القرآن" ہے جس کی حامل امتِ مسلمہ ہے۔ اسی مناسبت سے حضور ﷺ نے امت کو "یَااَھل القرآن" کے الفاظ سے مخاطب فرمایا۔ سبحان اللہ' کتنا پیارا خطاب ہے جو اس امت کو ملا۔ میں اس سے قبل بھی کسی موقع پر یہ عرض کر چکا ہوں کہ ہماری بہت سی غلطیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے غاصبانہ طور پر اپنے لئے "اہلِ قرآن" کا عنوان اختیار کیا' ہم نے بھی ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ نام انہوں نے حدیث کے بارے میں اپنے گمراہ کن نظریات پر پردہ ڈالنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ ان کا اصل نام ہونا چاہئے تھا "منکرینِ سنت" یا "منکرینِ

حدیث"۔ ہماری یہ بڑی نادانی ہے کہ ہم نے ان کے اس قبضۂ غاصبانہ کو تسلیم کرلیا اور ان کو یہ نام الاٹ کر دیا جس کے ہرگز وہ اہل نہیں ہیں! یہ خطاب تو حضور ﷺ نے اپنی امت کو دیا تھا، منکرینِ حدیث کو نہیں!!

اِس حدیث کا ایک ایک لفظ لائقِ توجہ ہے۔ کس قدر جامع ہیں نبی اکرم ﷺ کے یہ الفاظ جن میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کا کمال اختصار کے ساتھ احاطہ کرلیا گیا ہے۔ یہاں اس حدیث کی تشریح تو پیش نظر نہیں ہے، محض ایک نکتے کی جانب اشارہ کرکے ہم آگے بڑھیں گے۔ "یَا اھلَ القراٰن لا تتوسّدُوا القراٰنَ" کا سادہ سا ترجمہ تو یہ ہوگا کہ اے اہلِ قرآن اس قرآن کو تکیہ نہ بنالینا۔ لیکن یہاں تکیہ کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔ تکیہ چونکہ کمر کے پیچھے لگایا جاتا ہے لہٰذا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ اس قرآن کو پسِ پشت نہ ڈال دینا، اسے نظر انداز نہ کردینا۔ پھر یہ کہ تکیہ چونکہ سہارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو اس اعتبار سے مفہوم یہ ہوگا کہ اس قرآن کو محض ایک سہارا نہ بنالینا کہ بس اپنے ذہن میں اس کتاب کی تقدیس کا ایک گوشہ کھول کر اور اسے نہایت قیمتی جزدان میں اونچے طاق پر رکھ کر بڑے مطمئن ہو جاؤ کہ اس کی موجودگی باعثِ برکت ہے۔ اس کتابِ مبین سے ہمارا عملی تعلق بس اتنا رہ گیا ہے کہ کہیں قسم کھانے کی ضرورت پڑتی ہے، چاہے وہ جھوٹی قسم ہی کیوں نہ ہو تو اس کے لئے اس کتاب کو تختۂ مشق بنایا جاتا ہے، دم توڑتے شخص کو سورۂ یٰسین پڑھ کر سنادی جاتی ہے، یا بیٹی کو قرآن کا ایک نسخہ جہیز میں دے کر ایک رسم پوری کردی جاتی ہے۔ اللہ اللہ اور خیر سلّا! قرآن حکیم کے ساتھ ہمارا عملی رویّہ تو وہ ہونا چاہئے جو اس حدیث کی رُو سے سامنے آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حدیث کے ایک ایک لفظ میں ہمارے لئے فکری و عملی رہنمائی کا وافر سامان موجود ہے۔

اللہ کے اِس نُور کا جو محمد ﷺ کے توسط سے ہم کو ملا، جب ہم نے اتباع چھوڑ دیا تو اس دنیا میں اس کا یہ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ ہم یہاں ذلت و رسوائی کا ایک عبرت ناک مرقع بنے ہوئے ہیں۔ رہا عذاب اخروی، تو اس کے سزاوار بننے میں بھی ہم نے کوئی کسر اٹھا نہیں چھوڑی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی رحمت ہماری دستگیری فرمائے اور وہ ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائے تو دوسری بات ہے۔ اللہ اکبر! کیسا صادق آتا ہے ہمارے حال پر آنحضور ﷺ کا یہ فرمان جسے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا

ہے کہ "اِنَّ اللّٰہ یرفَع بھٰذا الکتابِ اقوامًا و یضعُ بہ اٰخرین O" یعنی "اللہ تعالیٰ یقیناً اس کتابِ عزیز کی وجہ سے کچھ قوموں کو عزت و سربلندی عطا فرمائے گا اور دوسروں کو (اس کتاب کو چھوڑنے کے باعث) ذلت و نکبت سے دوچار کرے گا"۔ گویا دنیا میں بحیثیتِ قوم ہماری تقدیر اسی کتاب کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس حدیث کی بہت عمدہ تعبیر کی ہے علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ ۔

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہوکر
اور "ہم" خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

آیتِ زیرِ نظر کے اس ٹکڑے "وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗ" پر غور کرنے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اس میں ایمان بالرسالت، توقیر و تعظیمِ رسولؐ اور نصرتِ رسولؐ یعنی نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی ان تینوں بنیادوں کا بھی پوری طرح احاطہ کر لیا گیا ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ اور اسی طرزِ عمل اور اسی روش کو اللہ تعالیٰ نے فوز و فلاح کا ضامن قرار دیا ہے، چنانچہ اس آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے: اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ O آیت کے اس حصے سے صاف طور پر مترشح ہے کہ فلاح و صلاح اور نجات، نبی اکرم ﷺ سے تعلق کی ان چار بنیادوں کی درستی پر موقوف ہے۔

اپنی گفتگو کو ختم کرنے سے قبل ایک بات مزید عرض کرنا چاہوں گا۔ میرے نزدیک مسلمانوں کی زبوں حالی اور ان کا زوال و انحطاط دراصل قرآن مجید سے دوری کا نتیجہ ہے۔ یہی بات بلند پایہ علمائے اسلام تقریروں اور تحریروں میں کہتے چلے آئے ہیں، جن میں سے ایک ایسی بزرگ ہستی کا حوالہ میں اِس وقت پیش کرونگا جو مجھ سے لاکھوں درجہ بلند و برتر شخصیت ہیں۔ وہ ماضی بعید کی نہیں، ماضی قریب کی ایک مسلّمہ محترم شخصیت ہیں اور وہ ہیں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ۔ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے دوران حکومتِ برطانیہ نے شیخ الہندؒ کو مالٹا میں اسیر کر دیا تھا۔ مولانا مفتی محمد شفیعؒ صاحب نے اپنی تالیف "وحدتِ امت" میں لکھا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہندؒ جب اسارتِ مالٹا سے واپس آئے تو ایک دن دارالعلوم دیوبند کے اکابر اور علماء کو جمع کیا اور فرمایا:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں، تو اس کے دو سبب معلوم

ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا' دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صَرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معنًا عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کئے جائیں' بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے انہیں آمادہ کیا جائے' اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے"۔

میں شیخ الہندؒ کی تشخیص کو صد فیصد صحیح سمجھتے ہوئے اور موجودہ تمام حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جو لوگ حقیقی معنوں میں اسلام کی روشنی میں پاکستان میں اصلاحِ احوال کے آرزومند ہیں ان کی تمام تر توجہ اللہ تعالیٰ کی اس کتابِ عزیز کی خدمت کی طرف مرکوز ہو جانی چاہئے۔ قرآن مجید کو پڑھنے اور پڑھانے' سمجھنے اور سمجھانے اور اس کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانے کی دعوت کو کامیاب کرنے کے لئے اپنی بہترین عملی جدوجہد اور قوتوں کو صرف کرنا اگر ہمارا نصب العین بن گیا اور ہمارے معاشرہ میں یہ بات ایک تحریک کی صورت میں چل نکلی تو جملہ مسائل حل ہوتے چلے جائیں گے۔ ایمان و یقین اسی کتاب سے حاصل ہو گا' عقائد اسی سے درست ہونگے' جاہلیتِ قدیمہ و جدیدہ کا ابطال اسی فرقانِ حمید سے ہو گا۔ شرک و بدعت کے اندھیرے اسی نورِ ہدایت کی ضیاپاشی سے دور ہوں گے' عمل و اخلاق کی اصلاح اور ان میں تبدیلی اسی کی تعلیمات سے ہو گی۔ معاملات اگر سنوریں گے تو اسی کتابِ مبین کی رشد و ہدایت سے سنوریں گے۔ اور اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہمارے ملک میں اسلامی نظام بھی اسی حبل اللہ کے اعتصام اور اس سے تمسک کے نتیجہ میں قائم ہو گا۔ اس کی بنیاد پر جو دعوت اٹھے گی اور نبی اکرم ﷺ کے طریق پر جو انقلابی کام ہو گا اسی کے نتیجے میں یہاں اسلامی نظام کا قیام ممکن ہو سکے گا۔ کسی اور ذریعے سے یہ تبدیلی ممکن نہیں ہے!

تعلیم و تعلّمِ قرآن کی عظمت و اہمیت اور قرآن حکیم کے "حبل اللہ" ہونے کے بارے میں درج ذیل تین احادیث نہایت اہم اور جامع ہیں۔ انہیں اپنے ذہن نشین کر لیجئے۔ پہلی حدیث کے راوی ہیں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ صحیح بخاری اور دیگر کتبِ حدیث میں یہ روایت موجود ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: "خَیرُکُم مَن تَعَلَّمَ القُراٰنَ وَعَلَّمَہٗ"

یعنی "تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں"۔

دوسری حدیث طبرانی کبیر میں حضرت جبیرؓ بن مطعم سے مروی ہے:

قال رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم: الیس تشھدُون اَن لا الٰہ الا اللّٰہُ وَحدَہٗ لا شریکَ لہٗ وانّی رسولُ اللّٰہ وانّ القراٰنَ جاءَ مِن عندِ اللہ؟ قلنا بلٰی - قال: فاَبشِرُوا فانّ ھذَا القراٰن طرفہٗ بیدِ اللّٰہِ وطرفہٗ بایدیکم فتمسّکوا بہٖ فانکم لن تھلکوا ولن تضلّوا بعدہٗ ابدًا

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ کہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟" ہم نے عرض کیا: یقیناً! تب آپؐ نے فرمایا: "پس تم خوشیاں مناؤ، اس لئے کہ اس قرآن کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ایک (دوسرا) سرا تمہارے ہاتھ میں۔ پس اسے مضبوطی سے تھامے رکھو! (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم اس کے بعد نہ کبھی ہلاک ہوگے اور نہ کبھی گمراہ"۔

تیسری حدیث کے راوی حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

قال رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم: کتابُ اللّٰہ ھو حبل اللّٰہ الممدودُ من السّماءِ اِلیَ الارض

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کی کتاب ہی اللہ کی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے"۔

حرفِ آخر

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی چار بنیادوں میں سے اولین بنیاد "ایمان" ہے اور دوسری توقیر و تعظیم، جو دراصل ایمان ہی کا فوری لازمی تقاضا ہے۔ ایمان و تعظیم ہی کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ رسول ﷺ کی پورے طور پر اطاعت کی جائے اور یہ کہ ہمارے دلوں میں رسول ﷺ کی محبت دوسرے تمام انسانوں سے بڑھ کر ہو۔ ان

دونوں چیزوں کے اجتماع کا نام "اتباعِ رسولؐ" ہے جو فی الاصل مطلوب ہے۔ حضور ﷺ سے ہمارے صحیح تعلق کی تیسری بنیاد "نصرت" ہے۔ اس نصرت کی ضرورت نبی کو اپنے کسی ذاتی کام کے لئے نہیں' بلکہ اپنے مشن کی تکمیل یعنی غلبۂ دین کی جدوجہد میں انہیں معاون اور دست و بازو درکار ہیں۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آپ ﷺ کے مقصدِ بعثت کی تکمیل ایک درجہ میں ہوئی یعنی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک۔ حالانکہ آپ ﷺ کی بعثت کل روئے ارضی کے تمام انسانوں کے لئے ہے۔ چنانچہ وسیع تر سطح پر دعوت و تبلیغ کا کام اور پورے کرۂ ارضی پر غلبۂ دین کا مشن ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے۔ یہ قرض امت کے ذمہ ہے' اس مشن کی تکمیل کا بوجھ امت کے کندھوں پر ہے۔ یہ امانت نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ہر اس شخص کی طرف منتقل ہوئی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستہ ہے اور حضور ﷺ کا نام لیوا ہے۔ حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی چوتھی بنیاد "اتباعِ قرآن مجید" ہے۔ اس آخری بنیاد میں ہمارے لئے اس طریق کار کی طرف بھی رہنمائی کر دی گئی ہے جس پر کاربند ہو کر دعوت الی اللہ کا فریضہ اور تواصی بالحق کی ذمہ داری ادا کرنی ہے۔ اس کتاب کو مضبوطی سے تھام کر' اس کے داعی' علمبردار اور پیغامبر بن کر ہمیں دنیا کے سامنے کھڑے ہونا ہے۔ حضور ﷺ کے مشن کی تکمیل کے لئے جدوجہد کا یہی صحیح طریقہ ہے اور اسی میں دنیوی و اخروی فوز و فلاح مضمر ہے۔

وَاٰخِرُ دَعوَانَا اَنِ الحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ ○○

ضرورت رشتہ

سعودی عرب میں مقیم دوسری شادی کے خواہشمند تنظیم اسلامی کے ایک رفیق کے لئے جو عالم دین بھی ہیں' ایک دیندار اور دینی تعلیم سے آراستہ' کم از کم میٹرک پاس خاتون کا رشتہ درکار ہے جس کی عمر ۲۵ سال سے زائد نہ ہو۔ تنظیم اسلامی سے منسلک خاندان کی بچی قابل ترجیح ہوگی۔ پہلی بیوی اور بچے ساتھ رہیں گے۔

برائے رابطہ ش-ن

معرفت شعبہ ادارت ماہنامہ میثاق

۳۶- کے' ماڈل ٹاؤن لاہور

تنظیم اسلامی کی دعوت

نجیب صدیقی

تنظیم اسلامی کی دعوت کو اگر ایک جملہ میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے "بندگیٔ رب کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ کیا جائے"۔ بندگیٔ رب کا تصور یہ ہے کہ انسان کل کا کل اللہ کا مطیع و فرمانبردار ہوجائے اور زندگی کے ہر گوشے میں اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوجائے۔ فرمانبرداری کا تصور یہ ہے کہ جب بھی وہ کوئی کام کرے تو دیکھے کہ اس میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم کیا ہے۔ جہاں اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہو وہ کرے، جہاں اللہ اور اس کے رسولؐ نے منع کیا ہے وہاں رک جائے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پوری بندگی نہیں ہے جبکہ اللہ کو پوری بندگی مطلوب ہے۔

جو لوگ بندگی کو مساجد اور کچھ رسوم و عبادات تک محدود سمجھتے ہیں وہ بڑے مغالطے میں ہیں۔ اللہ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں حکم دیا ہے کہ "اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ۔" (البقرہ : ۲۰۸) تمہارا جینا اور مرنا سب اسلام کے تحت ہو، تمہاری معاشرت یعنی شادی بیاہ، رسم و رواج تمام کی تمام اللہ اور اس کے رسولؐ کی مرضی کے مطابق ہوں۔ تمہاری معیشت، یعنی کاروبارِ دنیا، حصولِ رزق، تجارت، کھیتی باڑی، لین دین، تمام کے تمام اللہ اور اس کے رسول کے فرمان کے مطابق ہوں۔ تمہاری سیاست کی غرض و غایت خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا قیام ہو، یعنی وہ طرزِ حکومت جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا اور جس پر عمل کرکے آپؐ کے اصحاب نے ایک روشنی کا مینار تعمیر کیا جو رہتی دنیا تک لوگوں کی رہنمائی کرے گا۔ وہ طرزِ حکومت جس میں عدل و انصاف کے اعلیٰ معیار قائم ہوئے، حاکم و محکوم کا تصور ختم ہوا، ہر شخص قانون کی نظر میں برابر تھا، خلیفۂ وقت بھی اس سے بالاتر نہ تھا، جہاں حکمران ہٹو بچو کی صدا میں نہیں چلتے تھے، جہاں شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے، ہر شخص کی بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا، مکان حکومت کی ذمہ داری تھی۔ وہاں کسی انشورنس کمپنی کی ضرورت نہ تھی اور حادثات

کی صورت میں بیت المال موجود تھا' ناداروں کی کفالت کا نظام قائم تھا' عزت و شرافت کا معیار دولت نہ تھی بلکہ تقویٰ تھا۔ بندگی کا یہی مفہوم ہے جسے اسلام پسند کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو راستے بھی ہیں وہ بغاوت کے راستے ہیں۔ اس دوسرے راستے کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے: "کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہو اور ایک حصہ کا کفر کرتے ہو" اور اس طرزِ عمل پر یعنی دین کے کسی حصے پر عمل کرنا اور کسی کو چھوڑ دینا یا اس سے صرفِ نظر کرنا یا غیروں کا طریقہ اختیار کرنا' قرآن نے اس کے لئے سخت وعیدیں سنائی ہیں کہ اس کا نتیجہ دنیا میں ذلت و خواری اور آخرت میں شدید ترین عذاب ہے۔ (البقرہ: ۸۵)

جب ہم اپنے معاشرے کو دیکھتے ہیں تو یہ تضاد عریاں یعنی کھلم کھلا نظر آتا ہے۔ مسجد میں ہم اللہ کی بندگی کرتے ہیں اور مسجد سے باہر اللہ کے احکام کو بڑی ڈھٹائی سے توڑ دیتے ہیں' بلکہ اب تو یہ تصور یہاں جا پہنچا ہے کہ دین صرف مسجد کے اندر رہ گیا ہے اور بقیہ کو دنیاداری کہہ کر آزاد ہوگیا ہے۔ یہ مادر پدر آزادی زندگی کے ہر گوشے میں نظر آرہی ہے' گویا ہماری خواہشات ہمارا معبود ہیں۔ قرآن مجید نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے: "کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے؟" (الفرقان) ہماری خواہشات ہی سب کچھ ہیں نفس کی پرستش میں ہمارا ہر لمحہ گزر رہا ہے۔ جب بھی ہمارے سامنے کوئی معاملہ آتا ہے' خواہ وہ رسم و رواج ہو' کاروباری لین دین کا ہو یا سیاست کا ہو ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کو روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں' خاندان یا برادری کی بات مان لیتے ہیں' اپنے نفس کی خوشی پر احکامات دینیہ کو قربان کردیتے ہیں' پھر بھی ہم مسلمان ہیں اور امت محمدیہ میں ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ اللہ کہتا ہے سود حرام ہے' اسے اختیار کرنا اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ ہے مگر ہماری معیشت کے تمام سوتے اسی گندے چشمے سے نکلتے ہیں۔

تنظیم اسلامی بندگیٔ رب کی دعوت دیتی ہے۔ اس دعوت کا پہلا ہدف خود فرد کی اپنی ذات ہے۔ یعنی جس کلمہ پر تم ایمان لاتے ہو پہلے اسے اپنی زندگی میں جاری کرو' اپنی زندگی سے تضادات دور کرو' اللہ کے لئے اپنی بندگی کو خالص کرلو۔ یہی توحید کا تقاضا ہے' اسی کا نام ایمان ہے۔ تمہارے اپنے جسم پر اللہ کی حکمرانی ہو' تمہارے گھر میں اللہ کے

احکام توڑے نہ جاتے ہوں، تم اللہ کے دین کی گواہی اپنے قول اور عمل سے دو! یہی گواہی پورے معاشرے حتیٰ کہ ایوانِ حکومت تک دی جائے گی جس کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جس میں شامل ہونے والے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر برائی کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

تنظیم اسلامی اسی مقصد کے لئے قائم ہوئی ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کے دین کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں وہ مل جل کر اس کے جھنڈے کو تھامیں اور قدم ملاکر آگے بڑھیں۔ قرآن مجید میں اسلامی احکامات کس لئے بیان کئے گئے ہیں؟ کیا ان کی تلاوت سے اس کا حق ادا ہوجاتا ہے؟ اسلام ایک دین ہے اور دین غلبہ چاہتا ہے۔ اللہ نے اپنے رسولؐ کو حکم دیا تھا کہ اٹھو اور اسلام کو تمام ادیان پر غالب کردو! اور آپؐ نے غالب کر دکھایا۔ ہم آپؐ کے امتی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب تک ہم ان کے لائے ہوئے دین کو غالب کرنے کے لئے نہیں اٹھیں گے ہمارا دعویٰ جھوٹا ہوگا۔

یہ دعوت، یہ پکار اسی لئے ہے کہ اے مسلمانو جاگو! اس ذلت اور مسکنت سے نکلو! آج پوری دنیا میں تمہارا کوئی وزن نہیں، یہ صرف اس لئے ہے کہ تم نے اپنے دین سے وفاداری نہیں کی ہے۔ محض تمنا کرنے سے دین غالب نہیں ہوگا، اس کے لئے جدوجہد کرنی ہوگی جس طرح ہمارے نبیؐ نے جدوجہد کی تھی۔ آپؐ کی جدوجہد کا پہلا مرحلہ دعوت و تبلیغ کا تھا۔ آپؐ کی پکار تھی کہ اے لوگو، کہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، فلاح پاجاؤ گے! یہ فلاح کی طرف پکار تھی، نجات اخروی کے لئے بلایا جارہا تھا، ان کے کردار کی تعمیر کے لئے دعوت دی جارہی تھی ___ اور جو لوگ نبیؐ کی پکار پر جمع ہوگئے انہیں منظم کیا گیا، ان کی تربیت کی گئی ___ اور اس تربیت کے نتیجے میں ایک ایسی قوت وجود میں آگئی جس نے چند برسوں میں باطل قوتوں کو زیر کرکے اللہ کے دین کا بول بالا کردیا۔

ہمارے اس معاشرے میں جہاں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے انہیں ان کا عہد یاد دلایا جائے گا کہ تم نے اللہ سے ایک عہد کیا ہے، اس کے رسولؐ سے ایک معاہدہ کیا ہے لہٰذا اس عہد کو پورا کرو، اپنی زندگیوں میں اس دین کو نافذ کرو جس کے تم مدعی ہو ___ یہ دعوت اس وقت آگے بڑھے گی جب پکارنے والے خود اس دین پر عامل ہوں گے، ان کا اٹھنا بیٹھنا اس دین کے لئے ہوگا، ان کی زندگی کا مقصد اس کے قیام اور اس کے نفاذ کی

سعی و جہد ہوگی، وہ خوب اچھی طرح جان چکے ہوں گے کہ ان کی فلاحِ اخروی اسی بات سے وابستہ ہے کہ وہ اپنے عہد کو پورا کریں ___ جو لوگ اپنے اس فرض کو پہچان لیں گے انہیں تنظیم میں پرویا جائے گا، ان کی تربیت کی جائے گی اور اللہ نے چاہا تو اس طرح اتنی بڑی قوت وجود میں آجائے گی جو برائی کو بزورِ قوت مٹادے گی، لوگوں کے لئے اللہ کے دین پر چلنا آسان ہوجائے گا اور وہ فلاحی مملکت وجود میں آجائے گی جو نزولِ قرآن کا مقصد ہے، یعنی زمین عدل و قسط سے بھر جائے گی اور ظلم و جور سے پاک ہوجائے گی۔

تنظیم اسلامی آپ کو دعوت دیتی ہے کہ آپ اپنا وزن اس میں ڈال کر اس کو قوت بخشیں تاکہ پاکستان کی سرزمین پر اللہ کا دین غالب ہوجائے، نظامِ عدل قائم ہوجائے جس کے لئے آج انسانیت ترس رہی ہے، یہ ملک اسلام کا ایک ایسا "ماڈل" بن جائے جسے دیکھ کر دنیا اس دین کو لپک کر قبول کرے۔ کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں؟ ___ تنظیم اسلامی آپ کو آپ کا فرض یاد دلاتی ہے، وقت تیزی سے گزر رہا ہے، ہر لمحہ ہمیں زندگی سے دور اور موت سے قریب کررہا ہے، ایسا نہ ہو مہلتِ عمر ختم ہوجائے اور ہم سوچتے رہ جائیں۔

وما علینا الا البلاغ۔

• ایک مسلمان کی انفرادی و اجتماعی ذمہ داریاں کون کون سی ہیں؟
• دعوت و تبلیغ اور غلبۂ دین کی جدوجہد اضافی نیکی کے کام ہیں
یا بنیادی فرائض میں شامل ہیں؟
ان موضوعات پر ایک مختصر لیکن نہایت جامع کتابچہ
دینی فرائض کا جامع تصوّر
از: ڈاکٹر اسرار احمد
عمدہ کمپیوٹر کتابت • صفحات ۴۰ • قیمت: اشاعت خاص ۸/- ، اشاعت عام ۴/-
شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن، لاہور

سود سرمایہ داری کی جان اور اس کی روحِ رواں ہے

مرسلہ: مولانا مقصود احمد، رحیم یار خان

ہر وہ کاروبار جو سرمایہ داری کے اصول پر قائم ہو اس کا سود سے خالی ہونا محال ہے۔ بعض حضرات علمی اور عملی حیثیت سے اسلام سے منحرف ہو چکنے کے باوجود اعتقادی حیثیت سے قصداً اس دائرے سے نکلنا نہیں چاہتے کیونکہ عقیدہ کی بندش تو ان کو سود کی حرمت سے انکار نہیں کرنے دیتی مگر ان کا علم اور عمل ان کو مجبور کرتا ہے کہ سود کے متعلق اسلامی احکام کو توڑ کر ان کی ایسی تعبیر کریں کہ سود ایک اسم بے مسمّٰی ہونے کی حیثیت سے تو بدستور حرام رہے مگر نظامِ سرمایہ داری میں اس کے جتنے مسمّٰی پائے جاتے ہیں وہ تقریباً سب حلال ہو جائیں۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

بعض ناواقف لوگ دھوکے سے یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ جو غلطی (یعنی ربوٰ و سود) رائج ہو چکی ہے انسانی معاملات بس اسی پر چل سکتے ہیں اور اس کے سوا کوئی طریقہ بھی قابلِ عمل نہیں ہے۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ سود ہے تو برا مگر کام اسی سے چلتا ہے، اور حرمتِ سود ہے تو برحق مگر چلنے والی چیز نہیں۔ حقیقت میں دنیا میں جو طریقہ بھی رواج پا جاتا ہے انسانی معاملات بھی اسی سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر ہمت کر کے غیر سودی نظام رائج کر دیا جائے تو انسانی معاملات بس اسی پر چلنے لگیں گے۔ مشہور ماہرِ معاشیات لارڈ کینز کا قول ہے کہ جب تک سود کو کسی غیر تکلیف دہ طریقے سے معدوم نہیں کیا جاتا اس وقت تک دنیا سے بے روزگاری ختم نہیں ہو سکتی۔ سود معاشیات کے لئے ریڑھ کی ہڈی نہیں بلکہ اس میں پیدا ہو جانے والا کیڑا ہے جو اس کو کھا رہا ہے۔

"ربوٰ" کا ترجمہ سود، بیاج، انٹرسٹ (Interest) اور یوزری (Usury) ہے۔ اسلام نے سود مفرد (Simple Interest) اور سود مرکب (Compound Interest) دونوں کو حرام قرار دیا ہے۔ مؤخرالذکر سُود در سود (Interest added on the Principal) ہے

جسے قرآن نے "لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ "ربح" کا ترجمہ نفع فائدہ اور پرافٹ (Profit) ہے۔ فارسی زبان کے لفظ سود، ہندی کے بیاج اور انگریزی کے لفظ انٹرسٹ اور یوزری کا بھی اصولی طور پر وہی مفہوم و مطلب ہے جو عربی کے لفظ "الربٰو" کا ہے۔ ربٰو دراصل قرض کا وہ معاملہ ہے جس کی تہہ میں یہ غلط تصور کارفرما رہا ہے کہ قرض دینے والا (Usurer) اپنے مقروض کو ادائیگیٔ قرض کے لئے جو مہلت دیتا ہے اس کے بدلے میں وہ مقروض سے کچھ زائد مال لینے کا حقدار ہوتا ہے۔ پس سود کی تعریف یہ قرار پائی کہ قرض میں دیئے ہوئے رأس المال پر جو زائد رقم مدّت کے مقابلے میں شرط اور تعین کے ساتھ لی جائے وہ سود ہے۔

احکام القرآن للجصاص میں ہے:

"هو القرض المشروط فيه الاجل و زيادة مالٍ على المستقرض"

(Riba is the loan given for a specified period on condition that on the expiry of the period, the borrower will repay it with some excess.)

حدیث میں ہے: كُلّ قرضٍ جرّ نفعًا فهو ربو یعنی ہر وہ قرض جو کچھ بھی نفع حاصل کرے پس وہ ربٰو اور سود ہے (جامع الصغیر)۔ اس حدیث میں "نفعًا" کا لفظ نکرہ ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ قرض کے مال پر خواہ کتنی ہی کم زیادتی ہو وہ ربٰو کی تعریف میں آتی ہے یعنی ربٰو کا سبب مطلق زیادتی ہے خواہ تھوڑی ہو یا زیادہ۔

آج کل بینکوں کی شرح سود 15 فیصد ہے۔ اس طرح اگر آج ایک روپیہ بینک سے قرض لیا جائے تو ایک سال بعد قرض ایک روپیہ 15 پیسے ہوجاتا ہے۔ اگر یہی ایک روپیہ اور اس کا سود 10 سال بعد ادا کیا جائے تو کل رقم اصل زر سے چار گنا ہوجائے گی، یعنی تقریباً 4 روپیہ یا حسابی اعتبار سے 4.045 روپے۔ اور اس طرح بیس سال میں یہ رقم ایک روپیہ سے بڑھ کر معہ سود 16.36 روپے بنتی ہے۔ ہر دس سال میں اس رقم میں چار گنا مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس طرح آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ 50 سال میں صرف ایک روپیہ قرض مع سود 1083.65 روپے یعنی ایک ہزار تراسی روپے اور پینسٹھ پیسے بن جاتا ہے۔ اگر حساب ایک صدی کا لگالیا جائے تو یہی ایک

روپیہ 15 فیصد سود مرکب کی شرح سے 1,174,313.45 روپے یعنی گیارہ لاکھ چوہتر ہزار تین سو تیرہ روپے اور پینتالیس پیسے بن جاتا ہے۔ اب جبکہ ہم قوموں کی زندگی کی بات کر رہے ہیں تو سود کی لعنت کا اندازہ لگائیے کہ وہی ایک روپیہ کی رقم اگر 200 سال میں لوٹائی جائے تو یہ رقم بڑھ کر معہ اصل و سود1,379,012,000,000 یعنی 13 کھرب اناسی ارب ایک کروڑ بیس لاکھ روپے بن جاتی ہے۔ اگر حساب 1400 سال کا لگانا پڑے تو یہ رقم $94,836,694 \times 10^{6}$ ہوگی۔ اس طرح یہ رقم 86 ہندسوں پر مشتمل بنتی ہے' جن میں 78 بار صفر ہی صفر لکھنے پڑیں گے۔

سرمایہ دار لابی ہمیشہ یہی کہتی ہے کہ اتنی معمولی سی شرح سود (15 فیصد) سے بے روزگاری اور گرانی جیسے عظیم قہر کیسے برپا ہوسکتے ہیں؟ یہ سود کی ساخت کی ایک حیرت انگیز خوبصورتی ہے کہ اس کی مقدار وہ نہیں ہوتی جو نظر آتی ہے بلکہ سود در سود کی وجہ سے یہ اپنی بڑھوتری کو سادہ شرح سود کے لفافے میں لپیٹ لیتا ہے۔ اپنی جنرل تھیوری میں کینز لکھتے ہیں کہ 1972ء میں ایک جرمن بینک میں ایک سو مارک کی رقم سات فیصد سود پر دو سو پچاس سال کے لئے رکھوائی گئی۔ اس مدت کے بعد وہ (ایک سو مارک کی) رقم دو ارب اکیس کروڑ اناسی لاکھ دو ہزار چار سو مارک بن جائے گی۔ گویا اس کے ہر ایک سال کی سود کی اوسط اٹھاسی لاکھ اکہتر ہزار چھ سو نو مارک بن گئی۔ اب دیکھئے' شرح سود کہنے کو تو سات فیصد ہے لیکن دراصل اٹھاسی لاکھ فیصد ہے۔ اس طرح سود مرکب کی مدد سے لاکھوں فیصدی کی اصلیت کو سات فیصد کا لبادہ پہناکر ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول ڈالی جاتی ہے۔ سود کی ہر شرح ظلم ہے' زیادہ شرح زیادہ ظلم ہے لیکن کم سے کم شرح بھی ظلم ضرور ہے۔

ضرورت رشتہ

ارائیں برادری سے متعلق ۲۶ سالہ نوجوان' پرائیویٹ ملازمت گریڈ ۱۷ کے لئے جو تنظیم اسلامی کے رفیق بھی ہیں' ایسے دینی گھرانے سے رشتہ درکار ہے جہاں شرعی پردے کی پابندی کی جاتی ہو۔ برائے رابطہ: ڈ-ع

معرفت مینیجر مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن'
۳۶- کے' ماڈل ٹاؤن لاہور

کیا رشتہ داروں کے باہمی تعلقات بے پردگی پر موقوف ہیں؟

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تحریر سے ایک اقتباس

بعضی عورتیں جو متشرع ہیں وہ سب نامحرموں سے پردہ کرتی ہیں، حتیٰ کہ چچا زاد بھائی سے بھی۔ ان کے اوپر بڑے طعن ہوتے ہیں کہ بھلا بھائی سے بھی کہیں پردہ ہوتا ہے۔ عورتوں کے نزدیک چچا کا لڑکا ایسا ہے جیسا سگا بھائی۔ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "سگا بھائی" ہے لیکن یہ "سگا" وہ ہے جو "سگ" سے ماخوذ ہے۔ اور الف جو آخر میں لگا ہوا ہے یہ ہنڈا کی طرح ہے۔ بڑی ہانڈی کو ہنڈا کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح یہاں "سگا" کے معنی ہیں "بڑا سگ"۔

عورتیں تو عورتیں، ایسے پردہ سے مرد بھی خفا ہیں۔ کسی نے ہمت کرکے اپنے قریبی نامحرم رشتہ داروں سے بھی پردہ کرنا شروع کیا تو اب چاروں طرف سے اعتراض کی بھرمار ہے۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ میاں کچھ نہیں، اب عزیزوں میں آپس میں محبت ہی نہیں رہی۔ دوسرے صاحب بھی اینٹھ گئے کہ ان کے گھر جائیں تو کیا دیواروں سے بولیں؟ اب ہم ان کے یہاں جانا ہی بند کردیں گے۔ سبحان اللہ! کیا عزیزوں کے تعلقات اور آپس کا میل جول بے پردگی پر موقوف ہے۔ اگر یہ معنی ہیں تو نعوذ باللہ، اللہ میاں پر اعتراض ہے کہ ایسے قریبی رشتہ داروں کو بھی نامحرم قرار دے دیا۔ استغفراللہ۔ مگر اسی میں بعضی ایسی ہمت والیاں بھی ہیں کہ چاہے کوئی ہو وہ کسی نامحرم کے سامنے نہیں آتیں۔ چاہے کوئی برا مانے یا بھلا مانے۔ اور اکثر جگہ تو پردہ کی ایسی کمی ہے کہ دُور دُور کے رشتہ داروں کو بے تکلف گھر میں بلا لیتی ہیں اور بے محابا ان کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ بالکل ناجائز ہے اور گناہ ہے۔ مردوں کو چاہئے کہ وہ انہیں تنبیہہ کریں اور سب نامحرموں سے پردہ کرائیں۔ اگر کسی کو ناگوار ہو تو بلا سے ہو، کچھ پروا مت کرو، ہرگز ڈھیلا پن نہ برتو۔ بلکہ مردوں کو چاہئے کہ اگر کوئی نامحرم رشتہ دار عورت ان سے پردہ نہ کرے تو وہ خود اس سے چھپا کریں۔ اگر کوئی برا مانتا ہے مانا کرے، کچھ پروا نہیں کرنی چاہئے۔ برا مان کر کوئی کرے گا کیا؟ اچھا تو ہے سب چھوڑ دیں، کوئی اپنا نہ رہے۔ یوں ہی تعلق خلق سے گھٹے، جب کوئی اپنا نہ رہے گا اور سب توقع منقطع ہوجائے گی تب تو سوچے گا کہ بس جی اب تو

اللہ میاں ہی سے تعلق پیدا کرنا چاہئے' بقول کسے ع

جب کیا تنگ بتوں نے تو خدا یاد آیا

اب سمجھے گا کہ اعزہ' اقرباء' یار دوست' یہ سب حجاب تھے۔ اب کوئی حجاب نہ رہا (بقول جامع)۔

اب تو میں ہوں اور شغلِ یادِ دوست
سارے جھگڑوں سے فراغت ہوگئی

اب خدا کے بنو' جتنے تعلقات کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے۔ اور بھائی یہ تو سوچو کہ کس کس کو راضی کرو گے؟ راضی تو ایک ہی ہوتا ہے۔ کئی تو راضی ہوا نہیں کرتے۔ تو حضرت یہ کیجئے کہ صرف ایک اللہ کو راضی رکھئے۔ بہت سے آدمیوں کو کہاں سے راضی رکھئے گا۔ (طریق القلندر' اصلاح المسلمین)

عورتوں کی جملہ سرگرمیوں کا مرکز گھر کی چار دیواری ہے!

چند ماہ پیشتر ہمارے ایک وزیر مملکت نے جنہوں نے اپنے چہرے پر داڑھی بھی سجائی ہوئی تھی" خواتین کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "مولوی عورت کو گھر کے اندر قید کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ مختلف غزوات میں مسلمان خواتین نے شرکت کی ہے۔" وزیر صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ دورِ اول میں ہماری خواتین کی جنگوں میں شرکت اصولی نہیں بلکہ استثنائی شکل تھی (اور یہ پردے کے تفصیلی احکامات کے نزول سے پہلے کے چند ایک واقعات ہیں اور یہ شرکت بھی اپنے اعزاء و اقرباء کے ساتھ ہوا کرتی تھی) اسی طرح عورتوں کو اپنا زیادہ وقت "گھر" کے اندر گزارنے اور اسے اپنی جملہ سرگرمیوں کا محور بنانے کی بات کسی "مولوی" کی اپنی ذاتی سوچ یا اپج نہیں ہے بلکہ یہ قرآن میں خود خدا کا حکم ہے' خلفائے راشدین کا یہی ارشاد ہے۔ ائمۂ کرام کی یہی سوچ ہے اور دنیا کے مسلمان اور دیگر رہنماؤں کا یہی خیال ہے۔

(1) قرآن کریم کی سورۃ الاحزاب (33) میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے "اپنے گھروں میں

وقار کے ساتھ جمی بیٹھی رہو اور اگلے زمانۂ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو۔"
سورۃ النحل (80) میں فرمایا: "اللہ نے تمہارے لئے گھروں کو جائے سکون بنایا۔"

(2) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے (حضرت عائشہؓ سے خطاب کرتے ہوئے) "تم اپنے گھر میں جمی رہو کیونکہ یہی تمہارا جہاد ہے" (مسند احمد جلد 6 ص 28)
عورت پوشیدہ رکھی جانے والی مخلوق ہے جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی طرف جھانکتا ہے" (ترمذی - باب الرضاع)

(3) حضرت عمرؓ کا قول ہے: "عورت پوشیدہ رکھی جانے والی مخلوق ہے لہٰذا تم اس کو گھروں میں چھپاؤ" (عیون الاخبار جلد 4 ص 78)۔

(4) علامہ اقبال کا قول ہے: "عورت کا جنسی تقدس اس امر کا متقاضی ہے کہ اسے اجنبی نگاہوں سے ہر طرح محفوظ رکھا جائے۔ عورت ایک بہت ہی عظیم ذریعۂ تخلیق ہے اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی تمام تخلیقی قوتیں مستور و محجوب ہیں۔" (مضمون شائع شدہ لیورپول پوسٹ لندن 1933ء)

(5) جرمن مصنف رچرڈ گرن برگر "نازی جرمنی کی سوشل تاریخ" میں لکھتے ہیں "عورتوں کے لئے اس دور کا نعرہ بچے، چرچ اور باورچی خانہ تھا۔ ہٹلر کے دور میں یہ نعرہ "عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہے" زیادہ شدت سے گونجنے لگا۔ ہٹلر کا کہنا تھا کہ ہم نے عورتوں کو پبلک لائف سے جو الگ کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کو عزت کا مقام دینا چاہتے ہیں۔"

(6) روس کے مفکر ٹالسٹائی اپنی کتاب "حکم النبی" میں لکھتے ہیں: "عورت کا زیور اس کی پاک دامنی ہے اور پاک دامن وہ عورت ہو سکتی ہے جو گھر کے اندر رہتی ہو۔"

(7) روس ہی کے رہنما گورباچوف نے کتاب "ویمن مشن" میں کہا ہے: "خواتین کو گھروں میں رہ کر اپنی خاندانی ذمے داریاں سنبھالنی چاہئیں اور مرد جنگ کی آگ اور عورتیں باورچی خانے کی آگ جلانے کی زیادہ اہل ہیں" (نوائے وقت 18 - نومبر 87ء)
مغرب میں عورت نے "گھر" کو خیرباد کہا تو خاندان کا شیرازہ بکھر گیا، طلاقوں کی بھرمار ہو گئی، تقریباً نصف بچے ناجائز پیدا ہونے لگے، نوجوانوں میں جرائم کا رجحان بڑھا اور سو سال کے "آزادیٔ نسواں" کے تجربے کے بعد آخر "لیڈیز گو بیک ہوم" (خواتین واپس گھر جائیں)۔

کی زبردست تحریکیں شروع ہو چکی ہیں۔ عقلمندی کا تقاضا ہے کہ ہم مغرب کے تجربات سے عبرت حاصل کریں اور زیادہ "ماڈرن" ہونے کی کوشش نہ کریں۔

(مظہر علی ادیب لاہور)

KT
KHALID TRADERS
IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE
AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS

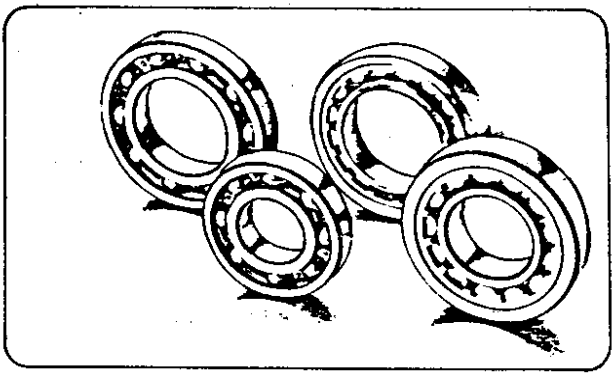

PLEASE CONTACT
TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65, Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

کراچی میں مبتدی تربیت گاہ کا انعقاد

(منعقدہ ۱۳ تا ۱۹/ اگست ۹۳۔ قرآن اکیڈمی، کراچی)

تنظیم اسلامی میں کارکنوں کی تربیت کا انتظام شروع ہی سے قائم ہے۔ ہر انقلابی جماعت کی یہ ضرورت ہے کہ اس کے کارکن اپنے مقصد سے شعوری طور پر آگاہ ہوں، طریقہ کار پر دل کا اطمینان ہو اور ان کی زندگی کا اہم ترین مقصد ہی یہ مشن ہو۔ دعوت اور مقاصد دعوت کو اپنے اندر اتارنے کے لئے تربیت گاہیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پھر ان تربیت گاہوں سے کارکنوں کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، ان کے اخلاق پر اس کے مثبت نتائج مرتب ہوتے ہیں، تعلق مع اللہ کا وہ پہلو جو دین میں مطلوب ہے نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے، غلبۂ اقامت دین کی جدوجہد میں تن من دھن لگانے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ ایک ہفتہ کی اس تربیت گاہ میں انسان کو ڈسپلن کی پابندی کرنے اور اپنے پر دوسروں کو ترجیح دینے کی عادت پڑتی ہے۔

یہ مستقل تربیتی نظام تنظیم کے مرکز لاہور میں قائم ہے، ملتزم اور مبتدی تربیت گاہیں بالعموم وہیں منعقد ہوتی ہیں۔ پاکستان کے مختلف علاقوں سے کارکن آکر اسی سے مستفید ہوتے ہیں۔ ناظم حلقۂ سندھ و بلوچستان جناب نسیم الدین صاحب نے مرکز سے درخواست کی کہ ایک مبتدی تربیت گاہ کراچی میں رکھی جائے تاکہ رفقائے حلقہ کی شرکت آسان ہو جائے۔ مرکز سے منظوری کے بعد ۱۳ تا ۱۹ اگست قرآن اکیڈمی کراچی میں اس کے انعقاد کا فیصلہ ہوا۔ مرکز سے جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب، ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان جو ناظم تربیت بھی ہیں، اور جناب حافظ محمد اقبال صاحب اس تربیت گاہ کے لئے تشریف لائے تھے۔ مقامی طور پر امیر حلقۂ سندھ جناب نسیم الدین صاحب اور کراچی کی ایک تنظیم کے امیر جناب نوید احمد صاحب نے بھی بطور مدرس اس تربیت گاہ میں حصہ لیا۔

۱۳ اگست کو ناظم اعلیٰ نے جامع القرآن قرآن اکیڈمی میں خطبۂ جمعہ دیا۔ آپ نے فرائض دینی کے جامع تصور کی جانب بڑے دلنشین انداز میں لوگوں کو متوجہ کیا۔ اس تصور پر گردش زمانہ نے اتنی دھول ڈال دی ہے جسے صاف کرنا آسان نہیں۔ اس تصور کو بار بار بیان کرنا اور لوگوں کے ذہنوں میں اتارنے کے لئے ایک بڑی محنت کی ضرورت ہے عبادت کے محدود تصور نے جو محض نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ تک محدود ہے لوگوں کے دلوں میں دینی ذمہ داریوں کے حوالے سے جو جھوٹا اطمینان پیدا کر دیا ہے اس پر ضرب کاری کے بغیر دلوں میں ہلچل پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس تصور کے ماند پڑ جانے یا نظروں سے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے امت کی نگاہوں کے سامنے آج وہ اعلیٰ مقصد ہی موجود نہیں ہے جس کے لئے اس امت کی تشکیل ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم زوال کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔

تربیت گاہ میں شرکت کے لئے کچھ رفقاء جمعہ سے قبل پہنچ چکے تھے اور بقیہ کی آمد جمعہ کے بعد ہوئی۔ عصر کے بعد تربیت گاہ کا افتتاح جناب نسیم الدین صاحب ناظم حلقہ سندھ و بلوچستان نے کیا۔ آپ نے تربیت گاہ میں شریک ہونے والوں کو خوش آمدید کہا اور بعض اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس وقت کو زیادہ سے زیادہ بامقصد بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ کچھ تمہیدی باتیں ناظم اعلیٰ صاحب نے بھی رفقاء کے سامنے رکھیں تاکہ دوران تربیت گاہ انہیں ملحوظ رکھ کر اس پروگرام سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکے۔ اس کے بعد شرکاء کو ایک دوسرے سے متعارف کرانے کے لئے ان کا باہمی تعارف کرایا گیا۔

تربیت گاہ کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے گذشتہ سطور میں عرض کیا جاچکا ہے کہ اس سے رفقاء کی ذہنی اور عملی تربیت مقصود ہے۔ چنانچہ ذہنی تربیت کے لئے دین کے جامع تصور کی وضاحت کی جاتی ہے کہ ہمارا دین محض چند عبادات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ پوری زندگی پر حاوی ہے اور کلی اطاعت کا تقاضا کرتا ہے۔ دین پر عمل پیرا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ دوسروں کو دین کی دعوت دینا اور دین کے غلبہ و اقامت کے لئے تن من دھن نچھاور کرنا بھی ہماری بنیادی دینی ذمہ داریوں میں سے ہے۔ اس بات کے سلسلے میں قرآن جو تصور پیش کرتا ہے جس کا نچوڑ آیۂ بر میں آگیا ہے اسے وضاحت سے بیان کیا جاتا ہے۔ تنظیم اسلامی اقامت دین کا جو عظیم کام لیکر اٹھی ہے اس جدوجہد کے ابتدائی مراحل کو ہم جہاد بالقرآن کا نام دیتے ہیں۔ جہاد بالقرآن کیا ہے، رفقاء اس کو مختلف لیکچروں کے ذریعے سمجھتے ہیں۔ اس راہ پر چلنے والی تحریکیں خواہ ان کا تعلق ماضی سے ہو یا عصر حاضر سے، ان کا جائزہ بھی پروگرام میں شامل ہوتا ہے۔ تاکہ رفقاء اس بات کو سمجھ لیں کہ ہماری تحریک کن کن باتوں میں ان تحریکوں سے مشابہ ہے اور کہاں کہاں ہم ان کے طریقۂ کار سے اختلاف کرتے ہیں، اور کیوں کرتے ہیں!! پھر جس معاشرہ میں ہم رہتے ہیں اسے رسومات نے اپنے تانے بانے میں جکڑ رکھا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب وہ اعلیٰ مقصد یعنی دین کی سربلندی کے لئے جدوجہد، نظروں سے اوجھل ہوگیا، غلامی در غلامی نے ہمیں اپنی گرفت میں لے لیا تو مذہب کے محدود تصور کے ساتھ نئی نئی رسمیں در آئیں۔ انسانی صلاحیت کو تو خرچ ہونا تھا، وہ ان رسموں کی بہاروں میں کھپ گئیں۔ جو رسمیں حضور ﷺ اور صحابہؓ کے دور میں نہیں تھیں ان سے ہمیں اعلان برأت کرنا ہے۔ اس لئے کہ یہ وہ بے جا بوجھ ہیں جو ہم نے خود اپنی گردنوں پر لاد لئے ہیں اور اب ہمارے معاشرے کا ایک بڑا طبقہ اس بوجھ کے نیچے سسک رہا ہے۔ یہ بڑا کٹھن کام ہے۔ یہ رسمیں مذہب کا "علم" بن گئی ہیں، اس "علم" کو ہمیں گرانا ہے۔

اس تربیت گاہ کے پروگرام میں نظام خلافت کی برکات کو رفقاء کے ذہن نشین کرانا بھی شامل تھا تاکہ وہ اپنے معاشرے میں جاکر لوگوں کو بتائیں اور ان کے ذہنوں میں جو مغالطے ہیں انہیں دور کریں۔ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اور اسلام کا قیام ہی اس کی بقا کا ضامن ہے۔ اس خطے میں جو لوگ آباد ہیں ان کی بقا بھی اسلام کے قیام پر منحصر ہے۔ یہ بات ہر شخص پر واضح کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے اس پروگرام میں رفقاء کے تفصیلی تعارف کے علاوہ امیر تنظیم اسلامی کے حالات زندگی سے واقف کرانا بھی شامل تھا

تاکہ رفقاء اپنے امیر پر وارد ہونے والے سوالات کے جوابات دے سکیں۔ ایک پیریڈ اس موضوع پر بھی تھا کہ جو لوگ اس تحریک میں شامل ہیں یا آئندہ شامل ہونگے ان کے کیا اوصاف ہونے چاہئیں' وہ خود اپنے اندر کیا تبدیلی پیدا کریں' ایک مقصد سے وابستہ ہونے کے بعد انہیں کون سی چیزیں ترک کرنی اور کیا اختیار کرنی چاہئے۔ دوران تربیت کوئی الجھن یا کوئی سوال پیدا ہوا ہو تو اسے حل کرنے کے لئے ایک سیشن سوال وجواب کا بھی رکھا گیا تھا۔

تنظیم اسلامی کی بنیاد اگرچہ بیعت پر قائم ہے مگر اس کا اندرونی نظام ایک تحریر شدہ دستور پر چل رہا ہے جسے ہم نظام العمل کا نام دیتے ہیں۔ اس نظام العمل کو سمجھے بغیر امیر و مامور کے فرائض و اختیار نہیں جانے جاسکتے۔ دوسرے پروگراموں کی وجہ سے اتنا وقت نہیں تھا کہ پورا نظام العمل پڑھایا جاتا اس کے اہم حصوں کو پڑھانے اور سمجھانے کی ذمہ داری ناظم حلقہ جناب نسیم الدین صاحب نے اپنے ذمہ لی تھی' آپ نے دو نشستوں میں اس کے بعض اہم حصے پڑھ کر سنائے اور ان کی ضروری وضاحت بھی کی۔ نظام العمل وہ پٹڑی ہے جس پر تنظیم کی گاڑی رواں دواں ہوتی ہے۔ اور جو شخص بھی اس پٹڑی سے اترے گا وہ خود بھی نہ چل سکے گا بلکہ دوسروں کے لئے بھی مسائل پیدا کرے گا۔ نظام العمل میں اختلافات کو حل کرنے کے لئے جو چینل موجود ہیں ناظم حلقہ نے اس کو تفصیل سے بیان کیا اور بورڈ پر لکھ کر ایک نقشہ کی مدد سے سمجھایا۔ دوسری جمہوری جماعتوں اور تنظیم اسلامی کے فرق کو واضح کیا۔ پھر اس تنظیم میں مشاورت کا جو نظام قائم ہے اور اظہار خیال کی جو آزادی ہے اس کا بھی تفصیل سے ذکر کیا۔ آخر میں ایک سوالنامہ تقسیم کیا گیا جس میں تربیت گاہ سے متعلق سوالات تھے اور آئندہ کے لئے تجاویز مانگی گئی تھیں۔ اختتامی کلمات میں ناظم حلقہ نے رفقاء کو مبارک باد دیتے ہوئے فرمایا کہ آپ کا جو وقت صرف ہوا ہے اس کا ایک ایک لمحہ اللہ کی راہ میں اس کی رضا کے لئے صرف ہوا ہے۔ جو یقیناً توشۂ آخرت بنے گا۔ آپ نے ان دنوں میں جو کچھ سیکھا ہے وہ دوسروں کو سکھایئے اور اس پر عمل کیجئے۔ دعا کے بعد یہ تربیت گاہ اپنے اختتام کو پہنچی۔

دیر میں امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت کی آمد' اور

جلسہ خلافت کا انعقاد

(اس جلسے کی ایک نسبتاً مختصر رپورٹ اگرچہ اس سے قبل ندائے خلافت' میں بھی شائع ہو چکی ہے تاہم امیر تنظیم کا یہ دورہ چونکہ غیر معمولی نوعیت کا تھا لہٰذا اس کی قدرے مفصل رپورٹ جو محترم محمد فہیم صاحب نے دیر سے ارسال کی ہے' ہدیہ قارئین میثاق کی جا رہی ہے)

یہ غالباً جون کے دوسرے ہفتے کا کوئی دن تھا جب تمرگرہ میں عصر کے وقت پشاور کے رفقاء نے دیر کے ایک روزہ دورہ کے بعد برلب سڑک ملاقات میں یہ بات بتائی کہ دیر میں ۲۲ جون ۱۹۹۳ء کو جلسہ خلافت کا انعقاد ہو گا جس سے امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب خطاب فرمائیں گے۔ رفقاء کی یہ ٹیم جناب

وارث خان ناظم تحریک خلافت سرحد، جناب ڈاکٹر اقبال صافی صدر انجمن خدام القرآن پشاور اور جناب حاجی خدا بخش صاحب کے علاوہ ضلع دیر سے ہمارے دوست جناب عبدالودود شاہ صاحب آف کامیٹ (ضلع دیر) پر مشتمل تھا۔ معلوم ہوا کہ مجوزہ دورہ جناب عبدالودود شاہ صاحب کی خواہش اور ان کے عملی تعاون ہی سے طے پایا تھا۔ (یہاں یہ بات بتاتا چلوں کہ شاہ صاحب ابھی تک تنظیم میں باقاعدہ شامل نہیں تھے تاہم وہ "متفقین" کے زمرے میں تھے۔ انہوں نے جلسہ دیر کے موقع پر بیعت کر کے اپنے آپ کو تنظیم اسلامی کے ساتھ منسلک کر لیا۔ اللہ قبول فرمائے)۔ ضلع دیر میں رفقاء کی تعداد تاحال بہت کم ہے اور وہ ایک دوسرے سے بہت دور رہائش پذیر ہیں۔ فی الحال تمام رفقاء اسرہ دیر سے منسلک ہیں۔ جغرافیائی دوری کی وجہ سے اجتماعات اور دیگر اجتماعی ماحول کے لئے ان کا اکٹھا ہونا کافی مشکل کام ہے۔ ان حالات کے پیش نظر دیر میں جلسہ خلافت کا انعقاد یقیناً ایک کٹھن کام دکھائی دے رہا تھا، تاہم سید عبدالودود شاہ صاحب کی ہمت ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر تمام مشکلات کے باوجود نہایت تندہی سے تمام مراحل طے کر لئے۔ دیر اور باجوڑ کے رفقاء سعید اللہ صاحب، احسان الودود صاحب، جہانزیب شاہ صاحب، محمد ناصر صاحب، گل رحمٰن صاحب، غازی گل صاحب، فیض الرحمٰن صاحب اور شیر اکبر خان صاحب کے ساتھ ابتدائی مشورہ کے بعد یہ طے پایا کہ مجوزہ جلسہ کے لئے منگل ۲۲ جون کے بجائے کسی چھٹی کے دن (یعنی جمعہ) کا انتخاب کیا جائے اور اس کے لئے مرکز سے رجوع کیا جائے تاکہ جلسہ میں تعلیم یافتہ حضرات کو شمولیت کا موقع مل سکے۔ چنانچہ پشاور اور مرکز کے ساتھ رابطہ کر کے یہ پروگرام جمعہ ۹ جولائی ۱۹۹۳ء میں تبدیل کر دیا گیا۔

اس سلسلہ میں مقامی طور پر تقریباً ۱۵۰۰ عوتی خطوط چھپوائے گئے اور پشاور سے ہینڈ بل اور پوسٹروں کا انتظام تحریک کے دفتر سے کیا گیا۔ ابتدائی تیاریاں محرم کی پہلی تاریخ سے شروع کی گئیں۔ اس سلسلہ میں پشاور سے ۱۴ رفقاء کا ایک گروپ محترم خورشید انجم صاحب کی امارت میں ۲۹ جون کو دیر پہنچ گیا۔ اس گروپ میں مندرجہ ذیل رفقاء شامل تھے: ڈاکٹر حافظ محمد مقصود صاحب، گوہر علی صاحب، محمد مقبول صاحب، حافظ جمیل اختر صاحب، اسرار اللہ صاحب، اصغر علی صاحب، محمد جمشید عبداللہ صاحب، نظام اللہ صاحب، پوردل خان صاحب، محمد یاسر حفیظ صاحب، محمد ناصر صاحب، فدا محمد صاحب، اور میر غیاث الدین صاحب۔ ان حضرات نے دیر اور ریحان کوٹ کی مختلف مساجد میں درس قرآن کے علاوہ اقامت دین اور فرائض دینی کا جامع تصور کے موضوع پر تقاریر کیں۔ مقامی طور پر سعید اللہ صاحب نے ان رفقاء کی بھرپور نصرت کی۔ راقم بھی جزوی طور پر ساتھ رہا اور ان رفقاء میں سے تین حضرات کو لے کر راقم شریاٹ برول بھی گیا جہاں پر وہاں کے رفقاء جہانزیب شاہ صاحب، محمد ناصر صاحب، بختور سید صاحب اور داؤد شاہ صاحب نے نصرت کر کے ان کے چار دروس قرآن اور دو خطابات جمعہ مختلف مساجد میں منعقد کروائے جن میں امیر محترم کے مجوزہ دورہ کی اطلاع بھی مقامی لوگوں تک پہنچائی گئی۔ یہاں کے رفقاء کو تقریباً دو سو عوتی خطوط بھی فراہم کئے گئے۔ اسی دن یعنی ۲ جولائی بروز جمعہ جناب عبدالودود شاہ صاحب دوبارہ حسب پروگرام دیر تشریف لائے۔ دیر میں امیر محترم اور ان کے ساتھیوں کے ٹھہرنے کے انتظام اور دیگر تفصیلات

پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ اس ابتدائی تیاری میں تنظیم کے نوجوان رفیق سعید اللہ نے (جو دیر ٹاؤن میں اس وقت تک تنظیم کے اکیلے رفیق ہیں) نہایت جاں فشانی سے کام کیا۔ وہ نہ صرف یہ کہ سہ روزہ پر آئے ہوئے رفقاء کے ساتھ ہمہ وقت موجود رہے بلکہ انہوں نے قرآن کالج کے تین مقامی طلبہ کو ساتھ ملا کر ان رفقاء کے لئے مختلف مساجد میں دروس قرآن کے پروگرام بھی ترتیب دئے۔ نیز سید عبدالودود شاہ صاحب سے مسلسل رابطہ رکھا۔ چنانچہ جمعہ ۲ جولائی کو تمام تفصیلات طے کرلی گئیں۔ شام تک دعوتی خطوط بھی تیار کئے گئے اور چند رضاکار طلبہ کے ذریعے ان دعوتی خطوط کو تقسیم کرنے کا پروگرام بھی طے پایا۔ ان نوجوانوں میں احسان اللہ صاحب اور ضیاء الرحمٰن صاحب بھی شامل تھے جو پہلے ہی سے ہمارے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ تاہم ہمیں اعتراف ہے کہ ہماری پبلسٹی بہت ہی کمزور رہی۔ خطوط اگرچہ نسبتاً بہتر طور پر تقسیم ہوئے مگر ہینڈ بلز اور پوسٹر بروقت اپنے ہدف پر نہ پہنچ سکے۔ اور پوسٹر تو بہت ہی کم لگائے جاسکے۔ مسٹر منظور احمد (ہارڈ ویئر سٹور والے) نے ان پروگراموں میں ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔

جمعہ ۲ جولائی کو ایک خبر یہ آئی کہ اسی تاریخ یعنی ۹ جولائی کو دیر میں ایک دینی سیاسی جماعت کا جلسہ بھی ہونے والا ہے۔ چنانچہ یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اس طرح تو کافی مشکلات درپیش ہوں گی۔ رابطہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس دینی سیاسی جماعت کے مقامی کارکنان نے ایثار اور قربانی سے کام لیکر اپنا پروگرام کسی اور تاریخ پر ملتوی کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں جناب صاحب زادہ جان عالم صاحب خطیب مقامی مسجد نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے مجوزہ جلسہ کو ملتوی کرانے کے لئے اپنے اکابرین کو مشورہ دیکر تعاون علی البر کا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔

ابتدائی تیاریوں کے بعد رفقاء اور احباب شدت سے ۹ جولائی کے منتظر تھے۔ جمعہ ۲ جولائی کو مقامی مسجد میں بھی خطاب جمعہ کے موقع پر مجوزہ جلسہ خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔ ۸ جولائی جمعرات کو جناب سید عبدالودود شاہ صاحب اپنے ۱۸ ساتھیوں کے ساتھ کامیٹ سے دیر پہنچے (یاد رہے کہ کامیٹ ضلع دیر کے مغرب کی طرف اس ضلع کا سرحدی حصہ کا گاؤں ہے جو دیر سے تقریباً ۱۰۸ کلو میٹر دور واقع ہے)۔ شاہ صاحب نے تمر گرہ سے کرسیوں اور شامیانوں کا انتظام کر رکھا تھا اور دو پک اپ بھی ساتھ لائے تھے جن کے ذریعے تمام مقامی امور انجام پائے۔ تاہم مزید کرسیوں کی ضرورت کے پیش نظر مقامی پبلک سکول کے پرنسپل جناب صاحبزادہ فضل اللہ صاحب سے مدد لینی پڑی جنہوں نے ازراہ شفقت سکول کے فرنیچر سے استفادہ کی اجازت عطا فرمائی۔

۸ جولائی کا دن رفقاء کے لئے یقیناً مسرت آمیز تھا جب امیر محترم رفقاء کے ایک مختصر سے قافلے کے ساتھ ۴ بجکر ۵۰ منٹ پر دیر پہنچے۔ عزیزم سعید اللہ اور جناب عبدالودود شاہ صاحب کی خوشیاں یقیناً بجا تھیں جن کی تگ و دو آج بار آور ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ امیر محترم کے ساتھ چودہ رفقاء کا ایک گروپ تھا جس میں جناب عبدالرزاق صاحب سیکریٹری تحریک خلافت پاکستان، جناب میجر فتح محمد صاحب وارڈن قرآن کالج لاہور، جناب اشفاق میر صاحب ناظم سرحد، جناب ڈاکٹر اقبال صافی صاحب اور جناب وارث خان صاحب

ناظم تحریک خلافت سرحد بھی شامل تھے۔ دیر ہوٹل میں امیر محترم کا استقبال ہوا جہاں آپ اور آپ کے رفقاء کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ جلدی میں موبائل لاؤڈ سپیکر کے ذریعے مقامی طور پر امیر محترم کی آمد کی خبر اور حسب پروگرام جلسہ کے انعقاد کا اعلان کیا جاتا رہا۔ شام اور اگلی صبح تک دوسرے علاقوں سے جو رفقاء جلسہ میں شرکت کے لئے دیر پہنچے ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔ باجوڑ سے ۶ رفقاء اور احباب میں سے ایک، تمرگرہ سے تین رفقاء، برول سندرول سے چھ رفقاء مع چھ احباب۔ اس دوران راقم کے دو چھوٹے بھائی دیر ہوٹل میں مہمانوں کے استقبال کے لئے موجود رہے۔ رات کا کھانا ایک قریبی دوست حاجی محمد یار صاحب کے ہاں طے تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد رفقاء و احباب اور مہمان حضرات امیر محترم کی معیت میں حاجی صاحب کے ہاں پہنچے۔ یہاں تحریک خلافت کے اس قافلہ کا نہایت پر تکلف دعوت کے ساتھ استقبال ہوا۔ حاجی صاحب اور ان کے نوجوان اعزہ اور بچے مہمانوں کی خدمات کے لئے پیش پیش تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے خلوص اور ایثار کا اجر عطا فرمائے، آمین۔

اگلی صبح جلسہ گاہ میں شامیانے لگوانے، کرسیوں کو ترتیب دینے اور عارضی سٹیج تیار کرنے کا کام نہایت سلیقے سے سرانجام پایا۔ سید عبدالودود شاہ صاحب اور ان کے ساتھ آئے ہوئے مہمان یہاں کے مقامی رفقاء کے ساتھ مل کر اس کام کو مقررہ وقت پر مکمل کر چکے تھے اور اب جلسہ شروع ہونے کا انتظار تھا۔ ہوٹل میں ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر مہمان حضرات بھی آٹھ بجے سے قبل جلسہ گاہ میں پہنچ چکے تھے جبکہ امیر محترم کو تقریر شروع ہونے کے وقت دیر سٹیڈیم پہنچنا تھا۔ تقریباً سوا آٹھ بجے جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ طالب علم قاری فیض اللہ صاحب (افغان مہاجر) نے سورۂ یوسف کے ایک حصہ سے تلاوت کی۔ سٹیج سیکریٹری کے فرائض راقم کے چھوٹے بھائی محمد زیب نے سرانجام دیئے، جنہوں نے سٹیج سے متعلق ذمہ داریوں کے علاوہ دیگر امور کو بھی نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ جلسہ کی صدارت کے لئے تحریک خلافت کی مرکزی کمیٹی کے ممبر اور بزرگ ساتھی جناب حضرت گل صاحب کا نام لیا گیا، انہوں نے صدارت کی کرسی سنبھالی۔ مولانا حضرت گل صاحب کا تعلق ضلع صوابی سے ہے۔ وہ اسی سلسلہ میں دس روزہ تبلیغی دورہ برائے خلافت کے لئے گھر سے نکلے تھے اور عین وقت پر جلسہ گاہ میں پہنچے تھے۔

جلسے کی پہلی تقریر ناظم تحریک خلافت سرحد جناب وارث خان نے کی۔ انہوں نے نہایت جذباتی اور پرکشش انداز سے نظام خلافت کا پیغام حاضرین تک پہنچایا۔ اس دوران جلسہ گاہ میں لوگ پہنچتے رہے۔ جلسہ میں شرکاء کی تعداد تقریباً ۷۰۰ تک تھی۔ جناب وارث خان کے بعد مولانا حضرت گل صاحب کی تقریر شروع ہوئی۔ آپ نے مختلف اعداد و شمار کے حوالے سے نہایت سادہ تمثیلات کے ساتھ بات لوگوں تک پہنچادی اور اور تحریک خلافت سے عملی تعاون کے لئے ان کے جذبات کو ابھارا۔ یہ دونوں تقاریر پشتو زبان میں کی گئیں۔

امیر محترم کی تقریر ۳۰-۹ پر شروع ہوئی اور ٹھیک پونے بارہ بجے ختم ہوئی۔ امیر محترم نے سورۂ نور کی آیات سے تقریر کا آغاز فرمایا۔ لوگ نہایت انہماک سے خطاب سن رہے تھے۔ دو گھنٹہ کی تقریر کے

دوران مجمع نہایت اطمینان سے ہمہ تن گوش رہا جبکہ بعض لوگ دھوپ میں بھی کھڑے رہے۔ امیر محترم نے اس وقت دنیائے اسلام اور امت مسلمہ کی مجموعی حالت کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا' امت کی زبوں حالی اور اس کی وجوہات پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا اور خلافت علیٰ منہاج النبوہ کے دوبارہ ظہور کے متعلق حضور ﷺ کے ارشادات کے حوالے سے بات واضح فرمائی۔ لوگ نہایت ذوق سے بات سن رہے تھے اور ان کے دلوں کے دریچے کھلتے جارہے تھے۔ یہاں سننے کے لئے وہ باتیں مل رہی تھیں جو زندہ باد' مردہ باد والے جلسوں میں کبھی نہیں ہوتیں۔ جلسہ میں اکثریت تعلیم یافتہ اور سنجیدہ افراد کی تھی۔۔۔۔ اس سے پہلے سٹیج سیکریٹری نے متعدد بار اعلانات کے ذریعے سامعین تک یہ بات پہنچائی کہ مقامی جامع مسجد المعروف مسجد باباصاحب میں خطاب جمعہ بھی امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد ہی ارشاد فرمائیں گے' اس کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوگی اور بعد میں نئے شامل شدہ رفقاء کی بیعت کا انعقاد بھی مسجد ہی میں ہوگا۔

امیر محترم کی تقریر ۱۱ بجکر ۴۰ منٹ پر ختم ہوئی اور جلسہ اجتماعی دعا کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ امیر محترم ضروری تیاری کے لئے اپنے قیام گاہ تشریف لے گئے اور رفقاء بھی ضروری تیاری کے بعد مسجد میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ٹھیک ایک بجے خطاب جمعہ کا آغاز ہوا۔ امیر محترم نے اقامت دین کے لئے اٹھنے والی جماعت کے اوصاف اور اس کی ہیئت ترکیبی کے لئے مسنون طریقہ کار پر احادیث اور سیرت النبی کی روشنی میں مفصل خطاب فرمایا اور دلائل سے واضح کیا کہ بیعت علی الجہاد ہی دراصل سلوک محمدی ہے۔ مسجد میں حاضری بھرپور تھی اور حاضرین زیادہ تر تعلیم یافتہ طبقہ سے تھے۔ ایک گھنٹہ کے خطاب میں حاضرین اسی جذبہ اور انہماک سے اپنی جگہ جمے رہے۔ نماز جمعہ کے بعد ایک گھنٹہ کے سوال و جواب کی نشست میں بڑی تعداد میں سوالات سامنے آئے جن میں اگرچہ چند ایک الٹے سیدھے سوالات بھی شامل تھے' تاہم اکثر سوالات سنجیدہ اور بامعنی تھے۔ امیر محترم نے ہر سوال کا نہایت بھرپور اور مسکت جواب دیا۔ بعض دینی جماعتوں کے متعلق ایک خاص پیرائے میں کئے گئے سوالات بھی سامنے آئے' تاہم جوابات بھی نہایت ہی وزنی اور مدلل دیئے گئے۔

اس نشست کے اختتام پر مسجد ہی میں نئے رفقاء سے بیعت لینے کی نشست ہوئی۔ لوگوں کو آج اس متروک سنت کو اپنے سامنے زندہ ہو کر دیکھنے کا موقع ملا۔ اکثر حاضرین عجیب قسم کی حیرانگی کے ساتھ دو درجن کے قریب حضرات کو اس بل دی ہوئی چادر جس کا ایک سرا امیر تنظیم کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا سرا بیعت کرنے والوں نے تھام رکھا تھا' پر ہاتھ رکھ کر بیعت کے مسنون الفاظ امیر محترم کے پیچھے دہراتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اس تقریب کے بعد امیر محترم رفقاء کے ہمراہ سیدھے عزیزم سعید اللہ رفیق تنظیم کے گھر تشریف لے گئے' جہاں آپ نے رفقاء کی معیت میں ماحضر تناول فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائی۔ دعا کے بعد آپ مع رفقاء پشاور کے لئے رخصت ہوئے۔ دیگر علاقوں سے آئے ہوئے رفیق بھی اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ چند ہی لمحوں کے بعد آسمان گرجا' بجلی کڑکی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اے اللہ تیرا کتنا احسان ہے کہ سخت گرمی کی شدت کو کم کرنے کے لئے امیر محترم کے ورود پر سے ایک دن

پہلے خوب بارش ہوئی، جلسہ کے دن مطلع صاف اور کبھی ابر آلود رہا۔ اور تمام تقریبات کے اختتام پر دوبارہ رحمت خداوندی برسنے لگی۔ امید واثق ہے کہ دیر کے عوام ایک دفعہ پھر کسی وقت امیر محترم کو اپنے درمیان اقامت دین کے سلسلہ میں ملاقات کے لئے پائیں گے۔

(مرتب: محمد نعیم، باجوڑ)

بقیہ : عرضِ احوال

کے پیش نظر یہ گمان کرنا کہ یہاں دینی قوتوں کو انتخابات میں ایسی فیصلہ کن کامیابی حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ پورے نظام کو بدل سکیں، حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ نظام کی تبدیلی انقلابی جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اسلامی نظام کا قیام صرف اس انقلابی طریق پر ممکن ہے جس کے رہنما اصول ہمیں سیرت مطہرہ سے ملتے ہیں۔ اس راستے کو چھوڑ کر اسلامی نظام کے قیام کا جو راستہ بھی اختیار کیا جائے گا وہ منزل تک پہنچانے والا نہیں بن سکتا۔ اسے آزمانا بلکہ آزماتے چلے جانا قوتوں، صلاحیتوں اور قیمتی اوقات کا ضیاع نہیں تو اور کیا ہے؟

☆ ☆ ☆

ربیع الاول کی مناسبت سے اس شمارے میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک اہم خطاب "نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں" شامل کیا گیا ہے جو اگرچہ اس سے قبل بھی کتابچے کی صورت میں دستیاب تھا لیکن ایک عرصے سے اس کے بارے میں ہماری خواہش تھی کہ اسے از سرنو مرتب کر کے اس میں شامل آیات و احادیث کے باقاعدہ حوالوں کے ساتھ، نئی کتابت کے ساتھ، گویا ظاہری اور معنوی دونوں اعتبارات سے پہلے سے بہتر شکل میں شائع کیا جائے۔ ہر کام کے لئے اللہ کی مشیت میں ایک وقت طے ہوتا ہے، الحمدللہ کہ ہماری یہ خواہش اس بار پوری ہوئی اور ماہ ربیع الاول میں ہم اس کتاب کو نئی صورت میں ہدیہ قارئین کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ آئندہ ان شاء اللہ کتابی صورت میں اس کا یہ نظر ثانی شدہ ایڈیشن ہی شائع کیا جائے گا۔ ○○

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

WORKING TOWARDS A BRIGHTER PAKISTAN

FULFILLING COUNTRY'S REQUIREMENTS FOR SUPERIOR QUALITY BASIC CHEMICALS !

LIGHT AND HEAVY SODAASH

FOR

GLASS, SILICATE, SOAP, DETERGENTS, LAUNDRY, TEXTILE, PAPER AND CHEMICAL INDUSTRIES

SAL

AND

SODIUM BICARBONATE B.P. GRADE

FOR

PHARMACEUTICALS, BEVERAGES, TANNERY, GUR MANUFACTURING, BAKING POWDER, CONFECTIONERIES AND FIRE EXTINGUISHERS, ETC.

SAL

SIND ALKALIS LIMITED

Landhi Industrial Area, Karachi.

Tele: 738891-92 & 738564

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

REG NO. L 7360
VOL. 42 NO. 9
Sep 1993

پاکستان کا سب سے زیادہ فروخت ہونے والا

قرشی

جوہر جوشاندہ

فلو، نزلہ، زکام اور گلے کی خراش کا مؤثر علاج

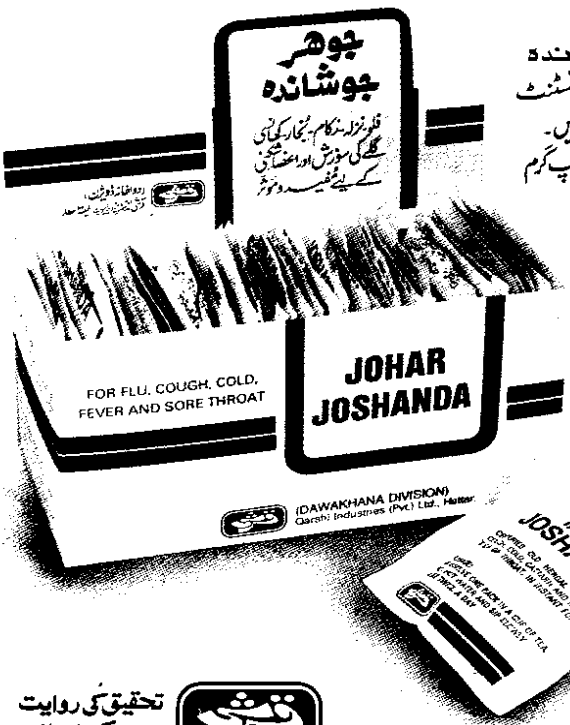

صدیوں سے آزمودہ جوشاندہ
اب فوری حل ہونے والے انسٹنٹ
جوہر جوشاندہ کی شکل میں۔
ترکیبِ استعمال: ایک کپ گرم
پانی یا چائے میں ایک پیکٹ
جوہر جوشاندہ ملائیں
اور جوشاندہ تیار۔
دن میں دو یا تین پیکٹ
جوہر جوشاندہ
استعمال کریں۔

تحقیق کی روایت
معیار کی ضمانت

قرشی

آسان استعمال
مؤثر علاج

Interflo